قرآن وسنت اور اسلاف امت کی تعلیمات کا داعی
دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ صدائے حق بنگلور

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری زیدت معالیھم

استاذ حدیث ومدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر

عبدالرزاق بنگلوری

نائب مدیر

مفتی عبدالرحمٰن بنگلوری

ناشر

مجلس، صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور-78

قرآن وسنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا داعی

دینی، علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین کا حامل

مجلّہ

صدائے حق بنگلور

جلد:۰۴	شمارہ:۶	ماہ دسمبر ۲۰۲۳ء	ماہ جمادی الثانی ۱۴۴۵ھ

سرپرست

حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم

استاذِ حدیث و مدیر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مدیر	نائب مدیر
عبدالرزاق بنگلوری	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری

مجلس ادارت

- مفتی محمد علی صاحب قاسمی
- مولانا محمد اُویس صاحب رشادی
- مولانا عبداللطیف صاحب قاسمی

مجلسِ مشاورت

- مولانا اشرف صاحب قاسمی
- مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری
- مفتی عبدالفتاح صاحب قاسمی

ADVERTISEMENT TARIFF

Full Page (Title Back Cover)	6000/-
Full Page (Title Inner Cover)	5000/-

Black and White

Full Page (Inside Pages)	2000/-
Half Page (Inside Pages)	1000/-
Cuarter Page (Inside Pages)	500/-

Phone Pe & Google Pay:7406464533

مضمون نگار کی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

شائع کردہ

مجلس: صدائے حق اسلامک پورٹل بنگلور 78

فہرست

عناوین	مضامین	اسمائے محررین	صفحہ نمبر
اداریہ	مسلم لڑکیوں کا ارتداد، ذمہ دار کون؟	مفتی عبدالرزاق بنگلوری	۳
درسِ حدیث	انسان کی موت اُس کی آرزوؤں سے زیادہ قریب ہے	مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری	۶
اصلاحِ معاشرہ	سیرتِ سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	مفتی عمران صاحب قاسمی	۱۱
// // //	دینی وتہذیبی شناخت کی حفاظت وقت کا اہم مسئلہ	مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی	۱۵
// // //	نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے	مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب	۲۰
// // //	تکبیر (اللہ اکبر) کی عظمت اور اہمیت	مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی	۲۴
// // //	مسجد کی کمیٹیوں سے کچھ گزارشات	مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی	۳۲
// // //	قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان (قسط ہشتم)	مفتی محمد سلطان خان صاحب قاسمی	۳۷
// // //	فلسطین تاریخ کے آئینہ میں	مولانا عبداللہ سلّمہٗ	۴۲

اطلاعِ عام

نوٹ: مضمون نگار اپنے مضامین مندرجہ ذیل ای میل (E-mail) یا واٹسیپ (WhatsApp) پر ان پیج (InPage) فائل روانہ کرسکتے ہیں، جزاکم اللہ خیراً وأحسن الجزاء.

Email: muftiabdurrahman57@gmail.com
Whatsapp No: 09620795460 - 9739349433

اداریہ

مسلم لڑکیوں کا ارتداد، ذمہ دار کون؟

از: مفتی عبدالرزاق بنگلوری

اِس وقت سوشل میڈیا پر مسلمان لڑکیوں کے ارتداد کے تعلق سے زبردست بحث جاری ہے۔ معلوم نہیں آیا اِن واقعات کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہے جتنی بیان کی جارہی ہے یا یہ صرف اتنی ہے جو ہندوستان یا کسی غیر مسلم معاشرے میں ہمیں اپنی کمیوں کے باعث کبھی کبھی اَدا کرنی پڑ جاتی ہے۔

بین المذاہب شادیوں کی یقیناً اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ حرکت باعثِ گناہ ہے؛ مگر ضروری نہیں ہے کہ ایسی تمام شادیاں ارتداد کا نتیجہ ہوں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں اس رشتے میں بندھے دونوں افراد غیر شرعی شادی کے گناہ کے ارتکاب کے علاوہ اپنے اپنے مذہب پر قائم ہیں۔

بہرحال علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک مسلمان کا مرتد ہوجانا بھی مسلمانوں کے لیے مصیبتِ کبریٰ ہے، بالخصوص عورتوں کا ارتداد، معاذ اللہ! معاذ اللہ! بڑا مہلک ہوگا، خدا نہ کرے کہ عورتوں میں اِس قسم کی تحریک سرایت کر جائے''۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صدی قبل جس خدشے کا اظہار کیا تھا آج وہ حقیقت کا روپ دھار کر مسلم معاشرہ کو ڈس رہا ہے۔ مسلمان لڑکیوں میں بڑھتے ہوئے فتنۂ ارتداد نے مسلم معاشرہ کی جڑوں کو ہِلا کر رکھ دیا ہے۔ جس تیزی کے ساتھ فتنۂ ارتداد مسلم لڑکیوں میں پھیل رہا ہے یہ مقامِ فکر وتدبر ہے۔ فتنۂ ارتداد کی روک تھام اور ایمانی تحفظ وبقا کے سلسلے میں مستقل لائحۂ عمل بنانے اور زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اور ان اسباب ووجوہات کو حل کرنے کی ضرورت ہے جن پر دہائیوں سے باتیں ہورہی ہیں؛ لیکن ان کو حل کرنے کی خاطر خواہ کامیاب کوشش بظاہر نظر نہیں آرہی ہے۔ جو حضرات فتنۂ ارتداد کے سدِّ باب کے لیے کمربستہ ہیں یا تو اُن کی رسائی بہت محدود ہے یا اُن کے وسائل بڑے پیمانے پر کام کرنے سے مانع ہیں، جن کو یہ دونوں چیزیں حاصل ہیں اُن کی ترجیحات میں اب تک یہ فتنۂ ارتداد شامل نہیں ہوسکا ہے؛ حالاں کہ فتنۂ ارتداد ایسا زبردست زہر ہلاہل ہے جو نہ صرف مسلم معاشرہ کو ذلّت ونکبت کی جانب دھکیل رہا ہے؛ بلکہ اِس کی وجہ سے آنے والی نسل بھی مذہبِ اسلام سے دُور اور بیزار ہوسکتی ہے۔

ایک تحقیقی جائزہ:

(۱) باضابطہ ایسے ہندو جوانوں کی ایک ٹیم تیار کی گئی ہے جنھیں فنڈنگ کی جاتی ہے، جن کا کام ہی محبت کے نام پر مسلمان لڑکیوں کو تباہ و برباد کرنا ہے، یہ لوگ پہلے ہمدردی کے نام پر کسی مسلمان لڑکی سے قریب ہوتے ہیں، پھر محبت کا فریب دیتے ہیں، اور شادی کا وعدہ کرتے ہیں، اور پھر جنسی استحصال کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۲) جو مسلمان لڑکیاں دینی ذہن یا گھر کی تربیت کی وجہ سے کچھ محتاط ہوتی ہیں، اُن کو قابو میں لانے کے لیے دوسری غیر مسلم لڑکیوں کا سہارا لیا جاتا ہے، وہ لڑکیاں اُس لڑکی سے دوستی کرتی ہیں اور پھر غیر مسلم لڑکوں سے دوستی کراتی ہیں۔

(۳) موبائیل اور زیراکس کی دوکانوں کے ذریعے بھی مسلمان لڑکیوں کے نمبر، اُن کی تصویریں اور دوسری معلومات اُن لڑکوں تک پہونچائی جارہی ہے، جو اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔

(۴) مسلمان لڑکیوں کو ورغلانے اور دامِ فریب میں پھنسانے کے لیے روپئے پیسے کا بھی بے دریغ استعمال کیا جارہا ہے۔

سدِّ باب:

یہ صورتِ حال ایسی سنگین ہے جس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، پانی سر سے نہیں چھت سے اُونچا ہوتا جارہا ہے، جس کے لیے چند باتیں ضروری ہیں:

(۱) اسلامی نظام کے مطابق مسلمان بچیوں کو پردے کا پابند بنایا جائے، اُن میں حیاداری، عفت وعصمت کی حفاظت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

(۲) مخلوط نظامِ تعلیم سے اپنی بچیوں کو بچایا جائے اور جو لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی ہیں، اُن کی دینی تعلیم وتربیت کا خیال رکھا جائے۔

لَو جہاد، مسلمان لڑکیوں کا ارتداد، احتیاط وتدابیر اور لائحۂ عمل۔

(۳) ٹیوشن کلاس کے نام پر اجنبی لڑکوں سے اختلاط کا موقع نہ دیا جائے۔

(۴) غیر مسلم لڑکیوں کی دوستی سے بھی روکا جائے۔

(۵) والدین وقت پر اپنی بچیوں کا نکاح کردیں، تعلیم کے نام پر تاخیر نہ کریں؛ کیوں کہ جنسی مخالف کی طرف میلان فطری تقاضا ہے؛ اِس لیے کم از کم نکاح کردیں، باقی کام بعد میں کرلیں؛ تاکہ لڑکی پُرسکون ہو جائے۔

(۶) جہیز اور بارات کی لعنت کو ختم کریں؛ تاکہ نکاح آسان ہوسکے، علمائے کرام جہیز والی شادیوں کا بائیکاٹ کریں۔

(۷) میری لڑکوں سے گزارش ہے کہ اگر کوئی لڑکی نکاح کے بعد تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہے تو اُسے اجازت دیں؛ تاکہ تعلیم نکاح میں رکاوٹ نہ بنے۔

لائحۂ عمل:

(۱) اپنی اولاد کے ہاتھ سے فون لے لیں۔

(۲) اپنی بڑی اولاد کو اِس کا پابند بنائیں کہ وہ اپنا دن بھر کا نظام العمل بنا کر کام کریں اور فون سے ضرورت کے علاوہ اوقات میں دُور رہیں۔

(۳) اولاد اپنے گھر کی اجازت کے بغیر باہر نہ جائے اور والد خوب تفتیش کر کے اطمینان کے بعد اجازت دے۔

(۴) کوئی کام والد اور والدہ کی اجازت کے بغیر نہ کرے۔

(۵) گھر کے نگران رات کو سونے سے قبل سبھی حضرات کے فون لے کر رکھ لیں۔

(۶) گھریلو نظام العمل میں کسی وقت دینیات کی ضرور تعلیم دے۔

حرفِ آخر:

اسلامی نقطۂ نظر سے ایمان ہی ہمارے تمام اعمال کی اَساس اور جملہ جدوجہد اور کدوکاش کی شاہِ کلید ہے، جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے، جس کے بغیر ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی؛ کیوں کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں؛ مگر روحانی آثار ونتائج کے اعتبار سے بے ثمر ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہی ہمارے اعمال کی غرض وغایت ہے؛ کیوں کہ میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی ہے۔

اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین!

درسِ حدیث

انسان کی موت اُس کی آرزوؤں سے زیادہ قریب ہے

ازقلم: مفتی عبدالرحمٰن صاحب بنگلوری، ناظم مدرسہ دارالتوحید، اعلیٰ ہلی بنگلور

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: هٰذَا ابْنُ آدَمَ وَهٰذَا أَجَلُهُ وَوَضَعَ يَدَهُ عِنْدَ قَفَاهُ ثُمَّ بَسَطَ فَقَالَ: وَثَمَّ أَمَلَهُ. (مشکاۃ: ص/٤٥٠)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تو ابنِ آدم (انسان) ہے اور یہ اُس کی موت ہے''، یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف رکھا (یعنی پہلے تو ایک جگہ اشارہ کر کے بتایا کہ یہ انسان ہے اور پھر اُس جگہ سے ذرا پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ اُس کی موت ہے) اُس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو پھیلایا (اور دُور اشارہ کر کے) فرمایا کہ: اس جگہ انسان کی آرزو ہے (یعنی انسان کی موت اُس کے بہت قریب ہے، جب کہ اُس کی آرزو اُس سے بہت دُور ہے)۔

تشریح:

''یہ ابنِ آدم ہے'' میں گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطبین کو ایک ظاہری اشارہ کے ذریعہ تصوراتی وجود کی طرف متوجہ کیا اور یہی اسلوب ''یہ اُس کی موت ہے'' بھی اختیار فرمایا گیا۔ اِس بات کو وضاحت کے ساتھ اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے کی جانب زمین کے گوشہ پر یا ہَوا میں اپنے ہاتھ کے ذریعے اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو یہ تصور کرو کہ یہاں انسان ہے، پھر اپنے ہاتھ کو پیچھے ہٹایا اور جس جگہ پہلے اشارہ فرمایا تھا اُس کے بالکل قریب عقب میں ہاتھ کو رکھ کر بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں گویا انسان کی موت ہے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو بالشت اور اُنگلیوں کی کافی کشادگی کے ساتھ پھیلایا۔ یابسط کے معنیٰ یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو اُس جگہ سے کہ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اشارہ فرمایا تھا، بہت آگے تک دراز کیا اور وہاں اشارہ کر کے بتایا کہ اس جگہ کو وہ مقام تصور کرو جہاں گویا انسان کی آرزو ہے اور اِس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس اسلوبِ بیان اور اشارہ کے ذریعہ گویا لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور متنبہ فرمایا کہ انسان کی موت اُس کے بہت قریب کھڑی ہے

جب کہ اُس کی وہ آرزوئیں اور اُمیدیں کہ جن کے پیچھے وہ مارامارا پھرتا ہے، اس سے بہت دُور واقع ہیں!

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کل امرئ مصبح في أهله ❖	و الموت أولٰی من شراک نعله
ہر آدمی اپنے گھر والوں میں صبح کرتا ہے	حالاں کہ اُس کی موت اُس کی جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

دنیا کی زندگی پر بھروسہ محض ایک دھوکہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَايَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ○﴾. (رقم الآية:۷، رکوع:۱٤)

البتہ جو لوگ اُمید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے دنیا کی زندگی پر اور اُسی پر مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔ (شیخ الہندؒ)

تشریح:

یعنی دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اِسی چند روزہ حیات کو مقصود و معبود بنالیا اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، اُن میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا، ضرور اِس سارے کارخانے کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب وغریب مخلوقات پیدا کردیں، اُس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

اتنے کھلے اور بھاری دلائل موجود ہونے کے باوجود کچھ لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں، تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس پر راضی ہو چکے ہیں۔

آخرت کے انکار کا پہلا اور بنیادی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان دنیا کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے، اس کی ساری محنت دنیا کی خاطر ہوتی ہے۔ انسان دنیا کی ہَوَس میں اِس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اُس کے سامنے اخلاقی قدروں اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ضابطوں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، وہ معمولی مفاد کی خاطر ایمان اور اپنی عزت کو بیچ دیتا ہے، بسا اوقات دنیا کے لالچ میں اِس قدر اندھا ہوجاتا ہے کہ اسے اپنے جگر گوشوں سے بھی زیادہ دولت، منصب اور شہرت پیاری ہوتی ہے، یہ مفاد پرستی اور غفلت کی انتہا ہے۔ بڑی سے بڑی دلیل اور عبرت ناک حادثات بھی اِس کی آنکھوں سے غفلت کی پٹی ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لیے جہنم کی آگ تیار کی گئی ہے، جس میں اُنہیں ٹھیک سزا دی جائے گی۔

دنیا میں انسان کی امیدیں اُس کی زندگی سے زیادہ ہیں:

پہلی حدیث:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا، وَخَطَّ خَطًّا فِي الْوَسَطِ خَارِجًا مِنْهُ، وَخَطَّ خُطُطًا صِغَارًا إِلٰى هٰذَا الَّذِيْ فِي الْوَسَطِ، مِنْ جَانِبِهِ الَّذِيْ فِي الْوَسَطِ، وَقَالَ: هٰذَا الْإِنْسَانُ، وَهٰذَا أَجَلُهُ مُحِيْطٌ بِهِ وَهٰذَا الَّذِيْ هُوَ خَارِجٌ أَمَلُهُ، وَهٰذِهِ الْخُطُطُ الصِّغَارُ الْأَعْرَاضُ، فَإِنَّ أَخْطَأَهُ هٰذَا نَهَشَهُ هٰذَا، وَإِنْ أَخْطَأَهُ هٰذَا نَهَشَهُ هٰذَا.

(بخاري: ج٢/ ٩٥٠، رقم الحديث: ٦١٧١)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک مربع شکل کا خط کھینچا اور وسطی خط کے درمیان کچھ خطوط کھینچے، ایک درمیان سے باہر نکلنے والا خط کھینچا اور فرمایا: یہ انسان ہے، اور یہ مربع اس کی موت ہے، جو اُسے گھیرے ہوئے ہے، اور جو خط باہر نکل رہے ہیں، وہ اُس کی خواہشات ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے خطوط آفات و بیماریاں ہیں، اگر ایک سے محفوظ رہا تو یہ دوسری اُسے آئے گی، اگر یہ بھی اُس سے خطا کر جائے تو تیسری آفت اُسے اپنا نشانہ بنالے گی۔

دوسری حدیث:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثًا، وَلَايَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ. (بخاري: ٢/ ٩٥٢، رقم الحديث: ٦١٩٩)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ: اگر ابنِ آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں، تو وہ تیسری کی خواہش کرے گا، ابنِ آدم کے پیٹ کو مٹی ہی بھر سکتی ہے اور اللہ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔

تیسری حدیث:

عَنْ سَهْلِ ابْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى أَرْضٍ بَيْضَاءَ عَفْرَاءَ كَقُرْصَةِ نَقِيٍّ، قَالَ سَهْلٌ: لَيْسَ فِيْهَا مَعْلَمٌ لِأَحَدٍ. (بخاري: ٢/ ٩٦٥، رقم: ٦٢٧٢)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز لوگوں کو سرخی مائل سفید زمین پر جمع کیا جائے گا، زمین میدے کی روٹی کی مانند ہوگی، زمین پر کسی قسم کا نشیب و فراز نہ ہوگا۔

امیدیں اُسی شخص کی زیادہ ہوتی ہیں جس کا اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا ہے اور جس کا ایمان اللہ پر نہ ہو اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

﴿اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ○﴾. ایسوں کا ٹھکانہ ہے آگ بدلا اُس کا جو کماتے تھے۔

(پ:۱۱، سورۂ یونس، رقم الآیۃ:۸، رکوع:۱)

جہنمیوں کی کیفیت:

﴿وَھُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْھَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ کُنَّا نَعْمَلُ، اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَّایَتَذَکَّرُ فِیْہِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَ کُمُ النَّذِیْرُ، فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ﴾. اور وہ چلائیں اُس میں ارب! ہم کو نکال کہ ہم کچھ بھلا کام کرلیں، وہ نہیں جو کرتے رہے (یعنی اُس وقت تو اُسی کو بھلا سمجھتے تھے، پر اب وہ کام نہ کریں گے، ذرا دوزخ سے نکال دیجیے تو ہم خوب نیکیاں سمیٹ کر لائیں اور فرماں بردار بن کر حاضر ہوں) کیا ہم نے عمر نہ دی تھی تم کو اتنی کہ جس میں سوچ لے جس کو سوچنا ہو اور پہنچا تمہارے پاس ڈرانے والا، اب چکھو کہ کوئی نہیں گنہگاروں کا مددگار (یہ جواب دوزخیوں کو دیا جائے گا۔ یعنی ہم نے تم کو عقل دی تھی، جس سے سمجھتے اور کافی عمر دی جس میں سوچنا چاہتے تو سب نیک و بد سوچ کر سیدھا راستہ اختیار کر سکتے تھے، حتیٰ کہ تم میں کہ بہت سے تو ساٹھ ستّر برس دنیا میں زندہ رہ کر مَرے، پھر اوپر سے ایسے اشخاص اور حالات بھیجے جو بڑے انجام سے ڈرانے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتے رہیں۔ کیا اِس کے بعد بھی کوئی عذر باقی رہا؟ اب پڑے عذاب کا مزہ چکھتے رہو اور کسی طرف سے مدد کی توقع نہ رکھو۔

دنیا کی حرص ہی لمبی اُمیدوں کا ذریعہ ہے:

انسان جتنا زیادہ دنیا اور اس کی چیزوں کی خواہشات میں مبتلا ہوگا اتنی زیادہ دنیا کی حرص اُس کے اندر بڑھتی جاتی ہے؛ یہاں تک کہ اُمیدیں باقی رہ جاتی ہیں اور موت آجاتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ، ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا، فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے، جیسے: عورتیں (یعنی جب اُن میں پھنس کر آدمی خدا سے غافل ہوجائے؛ اِسی لیے حدیث میں فرمایا: ”مَاتَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَۃً أَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ مِنَ

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○﴾.

(پ:۳، سورۂ آلِ عمران، رقم الآیة:۱۴، رکوع:۲)

النِّسَآءِ" میرے بعد مَردوں کے لیے کوئی ضرر رساں فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نہیں) ہاں! اگر عورت سے مقصود اعفاف اور کثرتِ اولاد ہو تو وہ مذموم نہیں؛ بلکہ مطلوب ومندوب ہے؛ چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے کہ اگر اُس کی طرف دیکھے تو خوش ہو، حکم دے تو فرماں بردار پائے، کہیں غائب ہو تو پیٹھ پیچھے شوہر کے مال اور اپنی عصمت کے معاملہ میں اُس کی حفاظت کرے، اِسی طرح جتنی چیزیں آگے متاعِ دنیا کے سلسلہ میں بیان ہوئیں سب کا محمود و مذموم ہونا نیت اور طریقِ کار کے تفاوت سے متفاوت ہوتا رہے گا؛ مگر چوں کہ دنیا میں کثرت ایسے افراد کی ہے جو عیش وعشرت کے سامانوں میں پھنس کر خدا تعالیٰ کو اور اپنے انجام کو بھول جاتے ہیں؛ اِس لیے ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ میں سطحِ کلام کی عام رکھی گئی ہے) اور بیٹے اور خزانے جمع کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے (یعنی جن پر نمبر یا نشان لگائے جائیں یا پانچ کلیاں گھوڑے جن کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی پر قدرتی نشان ہوتے ہیں یا جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑے گئے ہوں) اور مویشی اور کھیتی یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ (یعنی ابدی فلاح ان چیزوں سے حاصل نہیں ہوتی، محض دنیا میں چندروز فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، کامیاب مستقبل اور اچھا ٹھکانہ چاہتے ہو تو خدا کے پاس ملے گا۔ اُس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی فکر کرو)۔ (شیخ الہند مع فوائد عثمانی)

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو دنیا کی آرزوؤں سے محفوظ رکھے، دنیا کی چیزیں مزین ہو کر پیش ہونے سے محفوظ فرمائے، امیدوں کے مختصر اور کم کرنے کے اسباب مہیا فرمائے، آمین۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط سوم)

سیرتِ سیدنا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

ازقلم: مفتی محمد عمران صاحب قاسمی، مدرس مدرسہ مرکز العلوم ہیگڑے نگر بنگلور

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم سے پہلی امتوں میں محدّث یعنی صاحبِ الہام ہوتے رہے ہیں، اگر میری امت میں کوئی ہوسکتا ہے تو وہ عمرؓ ہیں۔ ترمذی میں بروایت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: عمر کی زبان اور قلب پر اللہ تعالیٰ نے حق کو جاری کر دیا ہے۔ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب کبھی لوگوں میں گڑبڑ ہوتی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ہوتی تو قرآن شریف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے موافق نازل ہوا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: جنات وانسان کے شیاطین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اور ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ شخص کہ خداوند تعالیٰ جس سے سب سے اوّل مصافحہ فرمائیں گے، سلام کریں گے اور ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کریں گے وہ عمر ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عمرؓ اہلِ جنت کے چراغ ہیں۔ بزار نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: یہ شخص جب تک تمہارے درمیان ہے تب تک فتنوں کا دروازہ بند رہے گا؛ بلکہ جب تک یہ زندہ ہے فتنوں کا دَروازہ بہت سخت بند رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا کہ عمر سے سلام کہہ دیجیے اور انہیں اس کی خبر دے دیجیے کہ ان کا غصہ غلبہ ہے اور ان کی رضا حکمتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آسمان کے تمام فرشتے عمر کی عزت کرتے ہیں اور زمین کے تمام شیطان ان سے ڈرتے ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ہم آپس میں ذکر کیا کرتے تھے کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مقید رہے اور آپ رضی اللہ عنہ کے بعد آزاد ہو کر ہر طرف پھیل گئے۔

حضرت سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ابوموسیٰ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خیریت بہت دنوں تک معلوم نہ ہوئی، آپ رضی اللہ عنہ ایک عورت کے پاس گئے، جس کے سر شیطان آتا تھا، آپ نے اُس عورت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق دریافت کیا، اُس نے کہا کہ جب مجھ پر شیطان آوے گا تب دریافت کر لینا؛ چناں چہ جس وقت وہ آیا تو دریافت کرنے پر اُس شیطان نے جواب دیا کہ میں نے اُن کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ ایک کملی کا تہبند باندھے ہوئے ایک صدقہ میں آئے ہوئے اونٹ کے (جس کے خارش ہوگئی تھی) قطران مل رہے ہیں، وہ ایسے آدمی ہیں کہ جب انہیں کوئی شیطان دیکھتا ہے تو خوف کے سبب ناک کے بل گر پڑتا ہے، خدا ہر وقت اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے اور روح القدس اُن کی زبان سے کلام کرتا ہے۔ حضرت ابواُسامہ فرماتے ہیں لوگو! تم جانتے ہو حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کون تھے؟ اسلام کے ماں باپ تھے۔ حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو شخص حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو بھلائی سے یاد نہ کرے میں اُس سے بیزار ہوں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ جلّ شانہٗ نے تمام اہلِ عرفہ پر عموماً اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خصوصاً فخر کیا ہے۔

طبرانی نے سدیسہ سے روایت کی، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: جس وقت سے عمر اسلام لائے ہیں جب کبھی اُن سے شیطان ملا ہے اُلٹے منہ گر پڑا ہے۔ اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھ سے جبرئیل علیہ السلام کہتے تھے کہ عمر کی موت پر اسلام روئے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ: روئے زمین پر مجھے حضرت عمرؓ سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے کسی آدمی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ذکی، ذہین اور سخی نہیں پایا۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: اگر عمرؓ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں اور تمام دنیا کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ کر وزن کیا جائے تو حضرت عمرؓ کا پلّہ بھاری رہے گا؛ کیوں کہ آپ کو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے دیے گئے ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تمام دنیا کا علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گود میں چھپا ہوا ہے؛ نیز آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں سوائے حضرت عمرؓ کے کسی شخص کو نہیں پہچانتا، کہ جس نے جرأت کے ساتھ خدا کی راہ میں سلامت کی پرواہ نہ کی ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت سبک فہم، تیز خاطر اور معاملہ فہم تھے، ہر کام کو اکیلے ہی کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ: حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس نہ دنیا آئی اور نہ انہوں نے اس کی خواہش کی؛ البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس دنیا آئی؛ مگر انہوں نے اسے دھکا دے کر نکال دیا اور ہم نے تو بالکل دنیا کو پیٹ میں بھر لیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس اُس وقت آئے جب کہ انتقال کے بعد اُن کو کپڑے سے ڈھانک دیا گیا تھا، اُس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کپڑا اوڑھے ہوئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کپڑا اوڑھنے والے سے زیادہ کسی کے اعمال پسندیدہ نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب نیک لوگوں کا ذکر کیا جائے تو ضروری ہے کہ اُن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا جائے؛ کیوں کہ آپ ہم سب سے زیادہ کتاب اللہ کے عالم اور دینِ خدا کے فقیہ تھے۔

طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کعبِ احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے پچھلے صحیفوں میں میرا ذکر کس طرح دیکھا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ: ہاں! آپ کے متعلق لکھا ہے کہ: آپ "قَرْنًا مِنْ حَدِیْدٍ" فولاد کی تلوار یا لوہے کا پہاڑ ہوں گے، آپ نے پوچھا اِس کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک ایسے حاکم پہلوان کہ خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کریں گے، آپ نے فرمایا پھر کیا لکھا ہے؟ انہوں نے کہا کہ: آپ کے بعد جو خلیفہ ہوں گے اُن کو تمام جماعت شہید کر ڈالے گی، آپ نے فرمایا پھر کیا لکھا ہے؟ کہا کہ پھر فتنہ وفساد پھیل جائے گا۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی فضیلت لوگوں پر ان چار باتوں سے معلوم ہوتی ہے: اوّل: جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق قتل کا حکم دیا اور آیت ﴿لَوْلَا کِتَابٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ﴾ اسی کے موافق نازل ہوئی، دوم: آپ نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہ کے پردہ کے متعلق فرمایا، جس پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے عمر بن خطاب! تم ہم پر حکم نافذ کرتے ہو؛ حالاں کہ وحی ہمارے ہی گھر میں اُترتی ہے؛ چناں چہ ان کے پردہ کے متعلق آیت نازل ہوئی ﴿فَاِذا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ، ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ"، سوم: حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے متعلق دعا کرنا کہ: الٰہ العالمین عمرؓ کو مسلمان کر کے اسلام کو قوی کر، چہارم: آپ کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سب سے اوّل بیعت کرنا۔

ابنِ سعد نے اخلف بن قیس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: ایک روز ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک جاریہ (لونڈی) گزری، لوگوں نے کہا کہ یہ امیر المؤمنین کی باندی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ امیر المؤمنین کی باندی نہیں ہے اور کیسی باندی جب کہ امیر المؤمنین کے لیے

خداوندتعالیٰ کے مال میں سے باندی رکھنی حلال بھی نہیں ہے، ہم نے عرض کیا: تو پھر کیا حلال ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: عمر کے لیے سوائے اِن چیزوں کے اللہ تعالیٰ کے مال سے کچھ حلال نہیں ہے (دو کپڑے جاڑوں کے، دو گرمیوں کے، حج اور عمرے کا خرچ، اپنا اور اپنے اہل وعیال کا کھانا اور یہ بھی مثل ایک مرد قریش معمولی درجہ کے موافق کہ نہ امیر ہو نہ فقیر، اس کے بعد میری بھی وہی حیثیت ہے جو ایک معمولی مسلمان کی)۔

خزیمہ بن ثابت کہتے ہیں کہ جب آپ کسی کو حاکم بنا کر کہیں بھیجتے تھے تو یہ شرط کر دیتے تھے کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہو، اچھا وعمدہ کھانا نہ کھائے، باریک کپڑا نہ پہنے، ضرورت مندوں کے لیے اپنے دروازہ کو بند نہ رکھے اور اگر ایسا کیا تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ ایک سال ذرا خشک سالی ہوئی، تو اُس سال گھی اور روغن دار کھانا چھوڑ دیا، ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے عاصم کے آئے اور اُنہیں گوشت کھاتے دیکھ کر فرمایا: یہ کیا کھا رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرا دل گوشت کو بہت چاہ رہا تھا آپ نے فرمایا: کیا جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا وہی کھانے لگو گے؟ جو شخص ہمیشہ اپنی طبیعت کے موافق کھائے وہ آخرت میں چور سمجھا جائے گا۔

ایک مسلمان اور ایک یہودی کا مقدمہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش ہوا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق فرما کر یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا، مسلمان اس فیصلہ پر راضی نہیں ہوا اور یہ مقدمہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے سماعت کے بجائے یہ فیصلہ کیا کہ یہ مرتد ہوگیا ہے؛ چناں چہ اُس کی گردن اُڑادی اور فرمایا کہ: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو منظور نہ کرنے والے کے لیے صحیح فیصلہ یہی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نمازِ جمعہ کے لیے کپڑے بدل کر جارہے تھے، راستہ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کے پرنالے سے مذبوحہ مرغی کے خون میں ملا ہوا پانی آپ کے اوپر گرا، آپ واپس مکان آئے، کپڑے بدلے اور پرنالے کے متعلق حکم فرمایا کہ راستہ سے ہٹادیا جائے، حکم کی تعمیل ہوچکی، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ یہ پرنالہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ لگوایا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی یہ سنا، فوراً اٹھے، پرنالہ پر تشریف لے گئے، کوئی سیڑھی نہیں تھی تو خود جھک گئے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو قسم دے کر فرمایا کہ: ان کی پیٹھ پر کھڑے ہوں اور پرنالہ کو اسی جگہ لگادیں جہاں آقائے نامدار محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا۔

❑❖❑

اصلاحِ معاشرہ (قسط اوّل)

دینی وتہذیبی شناخت کی حفاظت

وقت کا اہم مسئلہ

ازقلم: فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

''مؤرخہ: ۱۸؍تا ۲۰؍نومبر ۲۰۲۳ء کو جامعۃ الاسوۃ الحسنہ پلا پٹی (تامل ناڈو) میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا بتیسواں فقہی سیمینار منعقد ہوا، جس میں ملک بھر سے تین سو سے زیادہ علماء وارباب افتاء نے شرکت کی، سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں اس عاجز نے ہندوستانی مسلمانوں کو اکثریتی فکر وتہذیب میں جذب کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اُس پر روشنی ڈالی، صورتِ حال بھی پیش کی گئی اور اس کا حل بھی، موضوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اِس خطبہ کا متن تمہیدی مضمون کو حذف کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اور توجہ کے ساتھ پڑھنے کی گزارش کی جاتی ہے''۔ (رحمانی)

اِس وقت ملک کے جو حالات ہیں اور مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں، وہ دوپہر کی روشنی کی طرح واضح ہے، کہیں اسلامی شعائر کی اہانت، کہیں مسلم نوجوانوں کی ماب لنچنگ، کہیں مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ اور کہیں دوسرے رُسوا کن واقعات پیش آرہے ہیں، اور ان سب سے بڑھ کر وہ نفرت انگیز پروپیگنڈہ ہے، جس کے ذریعہ برادرانِ وطن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آگ سلگادی گئی ہے، بے برداشتگی کا ماحول پروان چڑھ رہا ہے، اور منظّم طور پر اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے، ضرورت ہے کہ پوری گہرائی کے ساتھ اس صورتِ حال کو سمجھا جائے، اور موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے درست لائحۂ عمل کی نشان دہی کی جائے، اسلامک فقہ اکیڈمی کا موضوع تو دَورِ جدید میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا حل ہے؛ لیکن فکری پہلو سے مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں، اکیڈمی نے ہمیشہ ان میں بھی رہنمائی کی کوشش کی ہے، اگر غور کیا جائے تو اس سیمینار کے عناوین میں جو ''تشبہ'' کا موضوع رکھا گیا ہے، وہ اس پہلو سے بڑا اہم ہے، جو موجودہ حالات میں اپنی ملی وتہذیبی شناخت کی حفاظت کی طرف متوجہ کررہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بھارت کی سرزمین نے دنیا کے مختلف مذاہب کا استقبال کیا ہے؛ لیکن یہ بھی

ایک حقیقت ہے کہ مشرکانہ سوچ اور تہذیب یہاں کے رگ وریشہ میں رَچی بسی ہے، اور اس سے بھی زیادہ دشوار بات یہ ہے کہ اس ملک کے ایک طبقہ نے دیگر مذاہب وافکار اور تہذیب وتمدن کو اپنے وجود میں جذب کرنے کی پُرفریب اور کامیاب کوشش کی ہے۔

مذہبی شدت پسندی اور مخالف فکر کو برداشت نہ کرنے کا جذبہ انسان کو اس طرف لے جاتا ہے کہ وہ دوسرے نظریہ کو ختم کردے، اس کی سب سے خطرناک صورتِ یہ ہے کہ دوسری فکر پر یقین رکھنے والوں کو مذہب بدلنے پر مجبور کردیا جائے، اور نہ ماننے کی صورت میں کوئی رحم کھائے بغیر تہہ تیغ کردیا جائے، اس کی مثال قدیم تاریخ میں بھی ملتی ہے، قرآنِ مجید میں کم ازکم اِس طرح کے دو واقعات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو عقیدۂ توحید سے روکنے کے لیے نسل کشی کی تدبیر اختیار کی کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بیٹا پیدا ہوتا، اسے قتل کردیا جاتا، نہ جانے کتنے بچے فرعونِ وقت کے اس ظالمانہ حکم کا شکار ہوئے (تفسیر السمعانی:۱/۷۷، بقرہ:۹۴)، اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ جو مذہبی منافرت کی بناء پر تشدد اور بے برداشت ہونے کا ہے، وہ ہے جسے ''اصحابِ اخدود'' کہا جاتا ہے، یہ حق پرست عیسائیوں کا واقعہ ہے، جن کو جیتے جی نذرِ آتش کرنے کے لیے ایک بڑی کھائی کھودی گئی اور کم وبیش ۲۰/ہزار افراد اس میں زندہ جلادیے گئے (قصص القرآن:۳/۳۲۲)، اسلام کے ابتدائی دَور میں بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے، جن میں بئرِ معونہ کے واقعہ میں ستر حفاظ صحابہ کی شہادت کا واقعہ ناقابلِ فراموش ہے (صحیح البخاری، کتاب المغازی باب غزوۃ الرجیع وبئر معونۃ، حدیث نمبر:۸۸۰۴)، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک رومی سردار نے کئی مسلمانوں کو توحید پر قائم رہنے کے جرم میں تیل کی کڑاہی میں تَل دیا؛ مگر ان کے پایۂ استقامت میں کوئی جنبش تک نہیں آئی۔ (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر:۹۳۶۱، ۲/۴۴۲)

اہلِ یورپ میں مذہبی شدت پسندی بہت زیادہ تھی، دنیا کی آنکھوں نے ماضی قریب تک اس کی مثالیں بار بار دیکھی ہیں، انھوں نے سرد جنگ میں فتح پانے کے بعد فلسطین میں جو مظالم ڈھائے، وہ تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہے، پھر یہ عیسائی شدت پسند ہی تھے، جنھوں نے یہودیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ہولوکاسٹ (Holocaust) کیا، اور بے شمار یہودی گیس کے چیمبروں میں ایک ایک قطرۂ آب کو ترستے ہوئے مار ڈالے گئے (مرگ انبوہ، دائرۃ المعارف برٹانیکا، ۲۰۰۷)، یہ مغرب ہی ہے، جس نے اندلس کے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر سمندر میں غرق کردیا، اور اپنے عہد کا کوئی پاس نہیں رکھا، اور ہزاروں مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے شہید کردیا؛ کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے، (خلافتِ اندلس نواب ذوالقدر جنگ بہادر:۴۲۴) مغرب نے سائنس وٹکنالوجی کی طاقت حاصل کی، اس کو بھی انھوں نے پوری ڈھٹائی

کے ساتھ اپنے مخالفین کو بے نام ونشان کرنے کے لیے استعمال کیا، جس کی مثال دوسری جنگِ عظیم میں جاپان کے دوآباد اور بھرے پُرے شہر ''ہیروشیما'' اور ''ناگاساکی'' پر نیوکلیئر بم کی بارش ہے، جس نے لاکھوں لوگوں کو لقمۂ اجل بنادیا، اور دُور کیوں جائیں، بوسنیا کے قتلِ عام کا تصور کیجیے اور شام اور عراق میں شہداء کی پاکیزہ روحوں کو یاد کیجیے کہ کس طرح خونِ انسانی کی ارزانی کا تماشا مشرق سے لے کر مغرب تک ساری دنیا نے دیکھا، غرض کہ کسی مذہب کی پیش قدمی یا کسی قوم کی بالادستی کو روکنے کے لیے تشدد کی بہت قدیم تاریخ رہی ہے، آر ایس ایس کے بانیوں اور رہنماؤں نے بھی بھارت کی اقلیتوں کے بارے میں اسی برتاؤ کی دعوت دی ہے (بھگوا دہشت گردی اور مسلمان، از: اعظم شہاب الدین: ۹۳- ساورکر، فکر وتحریک: ۱۳) اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کی پیش قدمی کو طاقت کے ذریعہ روک دیا جائے اور اپنے مقابل کسی اور مذہب اور سوچ کو برداشت نہ کیا جائے۔

کسی مذہبی گروہ کو ختم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فکری وتہذیبی طور پر ان کو اپنے وجود میں جذب کرلیا جائے، اس کی واضح مثال موجودہ عیسائیت ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی برحق تھے، اور انھوں نے انسانیت کو توحید کی دعوت دی تھی؛ مگر یہودیوں نے ان کے متبعین پر بڑے مظالم ڈھائے، یہاں تک کہ وہ فلسطین سے نکل کر مختلف جگہوں پر بھٹکنے پر مجبور ہوگئے، عیسائیوں پر جور وستم کے لیے اُکسانے والوں میں سے ایک اہم شخصیت راسخ العقیدہ یہودی پولس (POLUS) کی تھی، جو سینٹ پال (Saint Paul) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس نے جب دیکھا کہ تشدد کا ہتھیار کام نہیں آرہا ہے تو اس نے عیسائیت پر فکری پہلو سے شب خوں مارا، اس زمانہ میں دنیا کی مختلف قومیں تثلیث، یعنی تین خداؤں کا عقیدہ رکھتی تھیں، خود ہمارے ملک میں برہما، وشنو، شیو کے خدا ہونے کا تصور موجود تھا اور اب بھی ہے، فلسطین کے قریب روم ویونان میں بھی تثلیث کا تصور موجود تھا، اور تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے۔

سینٹ پال نے مخلصانہ یا منافقانہ طور پر عیسائیت قبول کرنے کے بعد عیسائیت کو روم ویونان میں مقبول بنانے کے لیے اس کو تثلیث کے سانچے میں ڈھال دیا، اور اس کے لیے باپ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاح ایجاد کی، جس کی خود انجیل میں کوئی صراحت نہیں ہے، آخر عیسائیت کا وجود ہمیشہ کے لیے تثلیث میں گم ہوکر رہ گیا، اگر قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح نہیں کیا ہوتا، تو شاید کبھی اس جھوٹ سے پردہ نہیں اٹھ پاتا، اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو بُت پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو پہلے تو انھوں نے طاقت کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی؛ لیکن جب ان کو اندازہ ہوگیا کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے تو صلح کا ایک فارمولہ پیش کیا، اور وہ

یہ کہ ہم لوگ بھی مسلمانوں کے خدا کو تسلیم کرلیں اور اس کی عبادت کریں اور مسلمان بھی ہماری دیویوں دیوتاؤں کو خدا مان لیں اور وہ بھی ان کی پوجا کریں، نیز ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کے لیے ایک ایک سال مقرر کرلیں، ایک سال ہماری دیویوں دیوتاؤں کی عبادت کا رہے اور ایک سال مسلمانوں کے خدا کی عبادت کا ہو، اسی پس منظر میں ''سورۂ کافرون'' نازل ہوئی (روح المعانی: ۵۸۴/۵۱)، یہ بظاہر صلح کی ایک کوشش تھی؛ لیکن درحقیقت یہ مسلمانوں کو اپنے وجود میں جذب کرنے کی سازش تھی، قرآن مجید میں صاف طور پر اس نقطۂ نظر کو رد کردیا گیا اور واضح کردیا گیا کہ توحید اور شرک دو متضاد چیزیں ہیں، یہ ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں، ممکن نہیں کہ ایک انسان بیک وقت ایک خدا کی بھی عبادت کرے اور بہت سارے خداؤں کی بھی۔

اس پس منظر میں اگر ہم اپنے ملک کی تاریخ کو دیکھیں تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ موجودہ ہندو توا کی ترجمانی کرنے والا گروہ برہمن بہت ہی گہری اور شعوری کوششوں کے ساتھ مخالف نقطۂ نظر کو اپنے راستے سے ہٹا کر اس کو مشرکانہ سوچ میں ضم کردیتا ہے، بودھ اصل میں توحید کے قائل تھے اور خدا کو ''علۃ العلل'' اور کائنات کا اصول اول قرار دیتے تھے، گوتم بدھ کی اصل دعوت برہمنوں کے اس تصور کو ختم کرنا تھا کہ پیدائشی طور پر کوئی انسان برتر اور کوئی کمتر ہے، برہمنوں کی من گھڑت رسموں سے نجات حاصل کرنا بودھ کی بنیادی تعلیمات کا حصہ تھی؛ اسی لیے برہمنیت کی طرف سے ان کی تحریک پر کفر کا فتویٰ لگا اور اس فرقہ کو ناستک، یعنی ملحد قرار دیا گیا، برہمنوں نے ان کے مندر توڑ ڈالے، ہزاروں لوگوں کو قتل کرڈالا، جب راجہ اشوک نے بودھ مذہب قبول کیا تو یہ اس خطہ کا غالب اور مقبول مذہب بن گیا، اور یہاں سے چین، جاپان، سری لنکا، کوریا، ویتنام اور تھائی لینڈ تک پھیل گیا؛ لیکن بالآخر ہوا یہ کہ جب ۱۰۲ء عیسوی میں راجہ کنشک تخت حکومت پر بیٹھا تو اس نے مہاتما بودھ کو خدا کا اوتار مان کر لوگوں کو ان کی مورتی کی پوجا کرنے پر آمادہ کرلیا، اور اس طرح ایک ایسا مذہب جس کی بنیاد اللہ کی توحید اور انسان کی وحدت پر تھی، شرک کے رنگ میں رنگ گیا، اب گوتم بودھ کی پرستش بودھ سماج کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے، اور اُن کی بڑی بڑی مورتیاں بنائی جارہی ہیں، یہاں تک کہ آج ہمارے ملک میں بودھ ہندو سماج کا حصہ بن گئے ہیں، اور بڑی چالاکی کے ساتھ ملک کے دستور میں بھی ان کو ہندو قرار دے دیا گیا ہے، اسی کی ایک مثال جین مت ہے، جو ایک بڑا فلسفیانہ مذہب ہے، اس کے دو بڑے فرقے ہیں، ایک دگامبر جو بے لباس رہتے ہیں، دوسرے: شوتامبر جو سفید کپڑے استعمال کرتے ہیں، یہ دونوں بنیادی طور پر بت پرستی کے مخالف ہیں، اس قوم کو مجسمہ سازی کے فن میں امتیاز حاصل رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایلورا اجنتا کے مندران ہی کی فنکاریوں کا نمونہ ہیں، جینیوں کو بھی آہستہ آہستہ پوری طرح مشرکانہ رنگ میں رنگ دیا گیا اور خود مہاویر جین کی

مورتی پوجا پران کو آمادہ کرلیا گیا، آج یہ بھی ہندو سماج کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

اسی کی ایک مثال سکھ مت ہے، اس مذہب کے بانی گرونانک جی کا زمانہ زیادہ دور نہیں ہے، وہ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے، وہ شروع سے توحید پر عامل تھے، اور بت پرستی سے دور رہتے تھے، انھوں نے جو مُول منتر، یعنی بنیادی کلمہ سکھایا، اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا ایک ہے، اس کا نام سچ ہے، وہی قادر مطلق ہے، وہ بے خوف ہے، اسے کسی سے دشمنی نہیں ہے، وہ ازلی وابدی ہے، بے شکل وصورت ہے، قائم بالذات ہے، (ہندوستانی مذاہب، ڈاکٹر رضی کمال ص:۳۶) یہ تحریک دراصل برہمنی رسوم ورواج کو ختم کرنے کے لیے شروع ہوئی تھی؛ اسی لیے سکھوں کے چوتھے گرو رام داس نے شادی اور مرنے کی رسوم ہندو مذہب سے الگ مقرر کیں، ستی کی رسم کی مخالفت کی اور بیواؤں کی شادی پر زور دیا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گرونانک جی اسلام سے زیادہ متأثر تھے، انھوں نے پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا، روزہ رکھنے کی تلقین کی، ختم نبوت پر ایمان لانے کو کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے کلام میں جا بجا ستائش کی اور اسلامی تعلیمات کو سراہا؛ مگر افسوس کہ سیاسی اختلافات اور اس سے پیدا ہونے والے جنگ وجدال نے ان کو مسلمانوں سے دور کردیا؛ لیکن آہستہ آہستہ سکھ سماج کو موجودہ ہندو سماج کا حصہ بنادیا گیا اور سکھوں کے انکار کے باوجود بہت ہی ڈھٹائی کے ساتھ دستوری طور پر ان کو بھی ہندوؤں میں شامل کرلیا گیا۔

(جاری.....)

اصلاحِ معاشرہ

نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے

ازقلم: مولانا محمد عمرین محفوظ رحمانی صاحب، سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو بہت ہی بہترین سانچے میں ڈھال کر بنایا ہے، انسان کی شکل وصورت، جسمانی صلاحیت اور اس کے اندر جو استعداد رکھی گئی ہے وہ عجیب وغریب ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بہت ساری چیزوں کو پیدا فرمایا، زمین اللہ کی، آسمان اللہ کا، ستارے اور سیارے اللہ کے، بادل، ہوائیں، فضائیں، درخت اور اس کے پتے اللہ کے، دریا، سمندر اور ان کے قطرے اللہ کے، بارش برسانے والا وہ، روزی دینے والا وہ، پورا نظام چلانے والا وہ، ہر ایک چیز پر قدرت رکھنے والا وہ، کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُسی کی پیدا کی ہوئی ہے، ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ﴾ (سورۂ زمر، آیت:۲۶) قرآن نے کہا کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے، سورۂ حشر کی آخری آیت میں بھی فرمایا: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى، یُسَبِّحُ لَهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴾ (سورۂ حشر، آیت نمبر:۲۴) وہ اللہ ایسا ہے جو پیدا کرنے والا، جان ڈالنے والا، تصویر بنادیتا ہے، دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ملے گا سوائے اُس خالقِ کائنات کے جو انسان کے جسم سے نکلنے والے چند قطروں پر انسان کی تصویر بنادیتا ہے اور ماں کے پیٹ کی تاریکیوں میں رکھ کر بچے کو وجود بخشتا ہے، اور اس کے بعد ماں کے پیٹ کی اندھیری سے نکال کر دنیا کے پیٹ میں ڈال دیتا ہے، اللہ پاک تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا، جان ڈالنے والا، اور تصویر بنانے والا ہے، وہ اللہ جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، چاند، سورج اور ستاروں کا پیدا کرنے والا ہے - یہ کائنات جو بڑی عظیم الشان ہے- اُسی کی پیدا کی ہوئی ہے، اللہ نے اس کائنات میں انسان سے بڑی بڑی مخلوقات پیدا کی ہیں، انسان تو پانچ ساڑھے پانچ فٹ کا ہوتا ہے؛ لیکن یہ زمین کتنی بڑی ہے، اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ زمین بھی سب سے بڑی نہیں ہے، اس سے بڑا آسمان ہے۔ اسمان پر غور کیجیے آسمان میں اللہ نے سورج رکھا ہے، جو اس دنیا سے سینکڑوں گنا بڑا ہے، اور صرف سورج نہیں قرآنِ کریم میں اللہ نے فرمایا: ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى﴾ (سورۂ نجم) اللہ پاک شعریٰ ستارے کا رب ہے، اور یہ ستارہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں آٹھ سورج سما سکتے ہیں، اور ہماری زمین جیسی ایک کروڑ زمینیں سما سکتی ہیں؛ اِسی لیے فرمایا کہ اللہ شعریٰ ستارے کا رب

ہے۔اللہ نے ہم سے بہت بڑی بڑی مخلوقات کو پیدا فرمایا؛لیکن انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○﴾(سورۂ تین،آیت:۴) بے شک ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے،انسان خدا کی سب سے زیادہ خوبصورت مخلوق ہے۔اللہ نے انسان میں خواہشات رکھی ہیں،اوراس کا یہ عجیب نظام ہے کہ اُس نے انسان میں جوخواہشات رکھی ہیں اُن کی تکمیل کا جائز اور حلال ذریعہ بھی رکھا ہے، کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کی تکمیل کا حلال راستہ اللہ نے نہ بتایا ہو،اللہ نے انسان میں جوخواہشات رکھی ہیں اُن میں ایک عورتوں کی خواہش ہے،قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا:﴿زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ﴾ (سورۂ آلِ عمران،آیت نمبر:۱۴) دنیا کے انسانوں میں عورتوں کی خواہش ڈال دی گئی اوراس خواہش کی تکمیل کا حلال ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نکاح کو بنایا ہے؛ اِسی لیے سرکارِدوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت قرار دیا،ارشاد فرمایا:"أربع من سُنن المرسلين" چار چیزیں تمام نبیوں کی سنت ہیں،اُن میں ایک چیز نکاح ہے۔(ترمذی)

اس نکتے کو یاد رکھیے! کہ نکاح ایک ایسی عبادت ہے جو دنیا کے پہلے دن سے جاری ہے اور آخری دن تک جاری رہے گی؛ بلکہ جنت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھے گا۔نماز اور روزہ پہلے دن سے نہیں ہے، حج اور زکاہ پہلے دن سے نہیں ہیں؛لیکن نکاح پہلے دن سے جاری ہے،اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کا حکم دیا،تو فرمایا:﴿وَقُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○﴾(سورۂ بقرہ،آیت نمبر:۳۵) اے آدم!تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو،اور جب زمین پر اُترنے کا حکم دیا تو اکیلے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم نہیں دیا؛ بلکہ فرمایا:﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ○﴾(سورۂ بقرہ،آیت نمبر: ۳۶) تم دونوں میاں بیوی زمین پر اُترو، یہاں دونوں کو حکم دیا گیا۔نکاح کی عبادت جنت میں بھی جاری رہے گی، اِس کی دلیل قرآن میں ہے،اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ ○﴾(سورۂ طور) ہم جنتی انسانوں کا نکاح بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے کرائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی خوبصورتی کو بیان فرمایا، وہ حوریں ایسی ہوں گی کہ اگر وہ دنیا میں تھوک دیں تو ان کے تھوک کی مٹھاس سے دنیا کے سارے سمندر میٹھے ہوجائیں،اوراگر ان کے بالوں میں سے کوئی ایک بال دنیا میں ظاہر کردیا جائے تو اس کی روشنی کی وجہ سے چاند اور سورج کی چمک دمک ماند پڑ جائے گی،ان کا حسن ایسا ہوگا کہ ان کے جسم کی ہڈیوں کا گودا باہر سے نظر آئے گا اور وہ ایسی حوریں نہیں ہوں گی جو اپنے شوہروں کو تکلیف دینے

والی ہوں۔ حدیث شریف میں کہا گیا کہ ادنیٰ درجہ کا جو جنتی ہوگا اللہ پاک اُس کو جنت میں ایک ہزار خادم اور ۷۲ حوریں عطا فرمائے گا، یعنی اُس کے ۷۲ نکاح ہوں گے۔ بعض وہ لوگ جو اپنی بیویوں کی بدزبانی سے پریشان ہیں وہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہاں تو ہم لوگ ایک ہی سے پریشان ہیں جنت میں ۷۲ حوریں ملیں گی تو وہاں کیا حال ہوگا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: اللہ پاک جنت میں جو حوریں عطا فرمائے گا اُن کی صفت یہ ہوگی کہ وہ بالکل پاک وصاف ہوں گی، نہ اُن میں کوئی جسمانی عیب ہوگا اور نہ کوئی روحانی عیب ہوگا، نہ وہ بدزبان ہوں گی، نہ بداخلاق ہوں گی، نہ شوہر کو نقصان پہنچانے والی ہوں گی اور نہ کسی کو اذیت پہنچائیں گی۔ حدیث شریف میں ان حوروں کا نغمہ ذکر کیا گیا، ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی پُرانی نہیں ہوں گے، اتنے سالوں سے وہ ہیں؛ لیکن پُرانی نہیں ہوئیں، اور نہ جنتی مَردوں کے ساتھ رہتے رہتے پُرانی ہوں گی، وہ ہمیشہ جوان رہیں گی، جیسا کہ غالب نے کہا تھا ؎

ایسی جنت کو لے کر کیا کریں غالبؔ
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

جنتی حوریں یہ بھی کہیں گی: ''**نحنُ الراضیاتُ فلانسخط أبداً**'' ہمیشہ راضی رہنے والیاں ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، پھر آگے کہیں گی ہم ہمیشہ تروتازہ رہنے والیاں ہیں، کبھی ہم پژمردہ اور اُداس نہیں ہوں گی۔

اللہ رب العزت نے یہ نظام رکھا ہے کہ دنیا میں بھی نکاح کا سلسلہ جاری ہے اور آخرت میں بھی جاری رہے گا؛ اِسی لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ میرا اور تمام نبیوں کا راستہ ہے، یہ پاکیزگی اور پاکدامنی کا راستہ ہے، یہ زناکاری وبدکاری سے بچانے والا راستہ ہے، اس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو نفس اور شیطان سے بچالیتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''**مَعْشَرَ الشَّبَابِ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْسَنُ لِلْفَرْجِ**'' اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرے؛ اِس لیے کہ یہ راستہ ایسا ہے جس کے ذریعے انسان کی نگاہ جھک جاتی ہے اور اس کی شرم گاہ محفوظ ہوجاتی ہے۔ پھر وہ زناکاری اور بے حیائی کے راستے پر نہیں جاتا، وہ نافرمانی کرکے خدا کے غصے کو دعوت نہیں دیتا۔ وہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے غلط راستے پر نہیں جاتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے یہ دو فائدے بتائے ہیں۔

حضرت عباس ابنِ وداعہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، ایک موقع پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو آپ نے پوچھا کیا تمہاری کوئی بیوی ہے؟ انھوں نے کہا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا تمہاری

کوئی باندی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں ہے، پھر پوچھا کیا تم جسمانی لحاظ سے تندرست ہو؟ اُنہوں نے کہا ہاں، الحمدللہ میں تندرست ہوں، پوچھا کیا تمہارے پاس مال بھی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں- اِس کے باوجد انہوں نے نکاح نہیں کیا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سخت الفاظ ارشاد فرمائے- آپ نے کہا: ''**إذن أنت من إخوان الشياطين**'' تب تو تم شیطان کے بھائی ہو، ''**إن كنت من النصاریٰ فالحق بهم**'' اگر تم عیسائیوں کی جماعت میں سے ہو تو جاؤ، اُن ہی میں مل جاؤ، اُن لوگوں کا راستہ یہی ہے کہ وہ نکاح نہیں کرتے، اپنے آپ کو عبادت میں لگائے رکھنے کے لیے وہ بال بچوں سے اپنے آپ کو کاٹ لیتے ہیں، انہوں نے خدا کی عبادت کے طریقے کو غلط رُخ دیا اور اور دنیا میں رہبانیت کو ایجاد کیا۔ ''**وَإِنْ كُنْتَ مِنَّا فَاصْنَعْ مَانَصْنَعْ**'' اور اگر تم ہم میں سے ہو تو وہ کرو جو ہم کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ تم نکاح کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح میرا طریقہ ہے، ''**فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّيْ**'' جو اس طریقے سے کٹے گا وہ مجھ سے کٹ جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**شرارکم عزابکم**'' تم میں سب سے بُرے لوگ وہ ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں، ''**وإن أرذلَ موتاكم عزابكم**'' اور تم میں بدترین مُردے بے نکاح مرنے والے انسان ہیں۔ یاد رکھیے! بے نکاحی زندگی گزارنا بُرائی کے راستے پر چلنا ہے اور بے نکاحی موت مرنا سب سے بُری موت ہے۔

اصلاحِ معاشرہ

تکبیر (اللہ اکبر) کی عظمت اور اہمیت

افادات: فضیلۃ الشیخ عبدالمحسن القاسم ادام اللہ فیوضہ، امام وخطیب مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام
ترجمہ: مفتی عبداللطیف صاحب قاسمی، استاذ مدرسہ عربیہ غیث الہدیٰ بنگلور

قارئینِ کرام! بروز جمعہ ۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۷؍اکتوبر ۲۰۲۳ء کو مسجد نبوی شریف کے فاضل امام وخطیب شیخ عبدالمحسن القاسم مدظلہٗ نے تکبیر ''اللہ اکبر'' کی عظمت واہمیت پر جمعہ کا خطبہ دیا، موضوع نہایت انوکھا، چشم کشا اور معلومات افزاء تھا، احقر کو بہت پسند آیا کہ امام موصوف نے بہت خوب صورت اسلوب میں تکبیر ''اللہ اکبر'' کی اہمیت، عظمت اور تکبیر کے مقامات کو خوب تلاش وجستجو کے ساتھ جمع کر دیا ہے، احقر کو خیال ہوا کہ مذکورہ خطبۂ جمعہ کو اُردو زبان میں منتقل کیا جائے؛ تاکہ تکبیر (اللہ اکبر) کا خوب اہتمام کیا جاسکے، مسلم معاشرے میں اس کی اہمیت وعظمت کو اُجاگر کیا جائے اور اس کو خوب عام کیا جائے؛ اِس لیے احقر نے جلی اور ذیلی عناوین قائم کیے، امام موصوف نے اجمالی حوالجات کو پیش کیا تھا، احقر نے تفصیلی حوالجات کا اضافہ کیا اور خطبۂ جمعہ کے لازمی ودعائیہ کلمات کو حذف کرنے کے بعد اُردو زبان میں اس کا ترجمہ کیا، اللہ تعالیٰ اوّلاً مترجم کو ثانیاً پوری امتِ مسلمہ کو تکبیر کا اہتمام کرنے اور اس کو خوب رائج کرنے کی توفیق نصیب فرمائے، اِس پاک کلمہ کی برکات سے مالا مال فرمائے۔ آمین یارب العالمین
فقط والسلام (معبداللطیف قاسمی، جامعہ غیث الہدیٰ، بنگلور)

تکبیر کی عظمت اور اہمیت

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَاهَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا، أَمَّا بَعْدُ:

اللہ کے اسماء وصفات کے علم سے عبدیت پیدا ہوتی ہے۔

انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے سے بندگی کی حقیقت پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے

اسماء وصفات کا علم سب سے اعلیٰ وافضل علم ہے، یہ وہ علم ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کی عبادت کا دارومدار ہے اور روحوں کی سب سے بڑی ضرورت اپنے خالق اور مالک کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

جس قدر بندہ خدائے بزرگ وبرتر کے اسماء وصفات کو جانتا ہے، اُسی کے بقدر اللہ سے انس، محبت، اس کی تعظیم وتکریم میں اس کا حصہ ہوتا ہے، اللہ کے اسماء وصفات کے علم میں جوں جوں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اُسی کے بقدر اس کے ایمان ویقین میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، جب بندے کے دل میں خدا کے ناموں اور صفات کا علم بڑھتا ہے، تو اس کا ایمان بھی بڑھتا ہے اور اس کا یقین پختہ ہوتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء اچھے ہیں؛ اِس لیے کہ وہ کمال وجمال پر دلالت کرتے ہیں، اللہ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام ''الکبیر'' ہے، یعنی بڑا، عظمت والا، اللہ تعالیٰ اپنی ذات، صفات اور افعال میں عظمت والے ہیں، جس شخص کو اِس بات کا یقین حاصل ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر برتر ہیں اور عظمت والے ہیں، تو وہ شخص صرف اُسی کی عبادت کرے گا، (اِس لیے کہ اُس کو یقین ہوگیا ہے کہ اُس کے سوا کوئی عظمت اور عبادت کے لائق نہیں ہے)۔

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ، وَاَنَّ مَایَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الْبَاطِلُ، وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ○﴾ (لقمان:۳۰)

''یہ اُمور (تدبیر وتسخیر کائنات) اللہ تعالیٰ اس لیے انجام دیتے ہیں؛ کیوں کہ وہی برحق معبود ہے، اس کے علاوہ جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے، وہ باطل (معبود) ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہی بلند وبرتر اور عظمت والے ہیں''۔

بے شمار مخلوقات ہیں، جن کا کوئی حساب نہیں، ظاہر آنے والی مخلوقات اور نظروں سے مخفی مخلوقات کا علم اور ان کی تفصیلات وہی عظمت والا جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالِ﴾ (الرعد:۹)

''اللہ تعالیٰ (مخلوق کی نظر سے) مخفی اور (مخلوق کو) نظر آنے والی چیزوں کو جاننے والا اور بلند وبرتر پروردگار ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اس کی بڑائی، عظمت اور ہر قسم کے عیب سے اُس کی پاکی بیان کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا ○﴾ (الاسراء:۱۱۱)

''آپ فرمادیجیے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، جس نے نہ کسی کو اولاد بنایا ہے، نہ اس کی سلطنت وحکومت میں اس کا کوئی شریک ہے، نہ وہ کمزور ہے کہ اُس کو مددگار کی ضرورت ہو، اللہ کی خوب خوب بڑائی بیان کیجیے''۔

تکبیر مومن کی زندگی کا لازمی حصہ:

آسمانوں اور زمین والوں کی تمام عبادات سے مقصود اللہ کی بڑائی، عظمت اور اُس کی بزرگی ہے؛ اِسی لیے تکبیر ''لفظ اللہ اکبر'' کہنا تمام بڑی عبادات کا شعار ہے، نماز میں تکبیر اللہ کے حضور میں عاجزی وانکساری کا مظہر ہوتی ہے، ایک دن میں پنج وقتہ نمازوں (مع سننِ راتبہ) کی تکبیرات اذان (واقامت کی تکبیر سے لے کر نماز سے فراغت کے بعد کے اذکار تک (چونتیس مرتبہ کے بشمول) تقریباً تین سو پچھتّر (۳۷۵) ہے۔

(احناف کے نزدیک چار سو تیرہ (۴۱۳) تکبیرات ہوتی ہیں؛ اِس لیے کہ احناف کے نزدیک اقامت میں چھ تکبیرات ہیں، سنتِ مؤکدہ بارہ رکعت ہیں اور بعد نمازِ عشاء وتر کی تین رکعت ہیں)۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: لفظ ''اللہ اکبر'' میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کو ثابت کرنا ہے، کبریائی کے مفہوم میں عظمت شامل ہوتی ہے؛ البتہ کبریائی معنیٰ ومفہوم کے اعتبار سے اکمل ہے۔

حج دینِ اسلام کے شعائر میں ایک عظیم شعار ہے، اس کا شعار ''صفا ومروہ'' پر رمی جمار کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی کبریائی کا اثبات ہوتا ہے، یعنی صفا ومروہ پر سبحان اللہ، والحمدللہ، ولا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر، رمی جمار کے موقع پر ''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔

عشرۂ ذی الحجہ کا پسندیدہ عمل تکبیر:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت والے دن ذی الحجہ کے دس دن ہیں، ان ایام میں سب محبوب عمل تکبیر کہنا ہے۔

چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مَامِنْ أَيَّامٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ، وَلَا أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنَ الْعَمَلِ فِيهِنَّ، مِنْ هٰذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ، فَأَكْثِرُوْا فِيهِنَّ مِنَ التَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّحْمِيدِ'' (رواہ احمد عن ابن عمر: ۵۴۴۶)

''اللہ کے نزدیک سب سے عظمت والے اور عمل کیے جانے کے اعتبار سے سب سے زیادہ محبوب ایامِ عشرۂ ذی الحجہ ہیں؛ لہٰذا ان ایام میں کثرت سے ''لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر اور الحمدللہ'' کہو''۔

خوش خبری اور قدرتی نشانیوں کے دیکھنے پر تکبیر:

خوشی اور مسرت کے موقع پر جیسے عیدین اور خوش خبریوں کے موقع پر تکبیر ''اللہ اکبر'' کہنا مسنون ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل روایت کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

''أَرْجُوْا أَنْ تَكُوْا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ''. (رواہ البخاری عن عبداللہ بن مسعودؓ، کتاب الرقاق، کیف الحشر: ٦٥٢٨)

''مجھے اُمید ہے کہ اہلِ جنت میں تمہاری تعداد نصف ہوگی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے (خوشی اور خوش خبری کی بنا پر) تکبیر ''اللہ اکبر'' کہی۔

قدرتی نشانیوں کے دیکھنے اور حیران انگیز مواقع میں تکبیر ''اللہ اکبر'' کہنا چاہیے۔

چند جدید الاسلام صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ جس طرح کفار کے لیے ایک درخت ''ذاتِ انواط'' ہے، اسی طرح ہمارے لیے بھی کوئی درخت متعین کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (بطورِ تعجب وحیرت) تکبیر ''اللہ اکبر'' کہی اور فرمایا: یہ درخواست ایسی ہے جیسے بنی اسرائیل نے (بچھڑے کی عبادت دیکھ کر) حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا: ہمارے لیے بھی ایک معبود مقرر کر دیجیے، جیسے ان کفار کے لیے معبود ہے۔ (رواہ الترمذی عن ابی واقد اللیثی، کتاب الفتن: ٢١٨٠)

سفر کے موقع پر تکبیر:

حالتِ سفر میں غم ورنج، خوف اور اندیشے درپیش ہوتے ہیں، ایسے مواقع میں اللہ کی بڑائی اور عظمت بیان کرنے سے اطمینان وسکون میسر ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سواری پر سوار ہوکر باہر تشریف لے جاتے، تو تکبیر کہتے۔

جب مخلوقات میں اللہ کی عظمت کا مشاہدہ کریں، تو تکبیر کہنا مسنون ہے، جیسے کسی بلندی پر چڑھیں، تکبیر کہنا مسنون ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''كُنَّا إِذَا صَعِدْنَا، كَبَّرْنَا، وَإِذَا تَصَوَّبْنَا، سَبَّحْنَا''. (رواه البخاري عن جابر، كتاب الجهاد والسير، باب التكبير كذا علا شرفا: ٢٩٩٤)

''جب ہم بلندی پر چڑھتے، تو تکبیر کہتے، جب پستی کی طرف آتے، تو سبحان اللہ کہتے''۔

سونے کے وقت تکبیر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر تشریف لے آتے، تو تینتیس مرتبہ ''سبحان اللہ''، تینتیس مرتبہ ''الحمد للہ'' اور چونتیس مرتبہ ''اللہ اکبر'' فرماتے۔(رواہ النسائي عن عبد الله بن عمر، كتاب السهو، باب عد التسبيح بعد التسليم: ١٣٤٨)

طاعات کی توفیق پر تکبیر:

اہم اور عظیم مواقع میں تکبیر کو مشروع کیا گیا ہے، ہدایت ایک عظیم نعمت ہے، دینی شعائر کی طرف رہبری اور طاعات کی توفیق پر تکبیر کہنا نعمتِ توفیق وہدایت پر شکر گزاری ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا، وَلَادِمَآءُ هَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوىٰ مِنْكُمْ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ﴾ (الحج:۳۷)

اللہ تعالیٰ کے پاس ان قربانیوں کا نہ گوشت پہنچتا ہے، نہ ان کا خون، اللہ کے نزدیک تمہارے دلوں کا پہنچتا ہے، اِس طرح چوپایوں کو تمہارے قابو میں کر دیا؛ تاکہ اللہ نے تم کو (ادائے قربانی وغیرہ طاعات کی) جو توفیق عطا فرمائی ہے، اس پر تم اس کی بڑائی بیان کرو (اللہ اکبر کہو)؛ نیز اپنی استقامت، ثابت قدمی اور اعمال کی توفیق پر اللہ کی بڑائی بیان کرنا (اللہ اکبر کہنا) استقامت اور توفیقِ طاعات پر شکر گزاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَاهَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (البقرہ:۱۸۵)

''(روزہ کی مقررہ) تعداد پوری کرلو؛ نیز اللہ نے تمہیں ہدایت (روزوں کی توفیق) عطا فرمائی، اس پر اُس کی بڑائی بیان کرو اور اُس کا شکر کرو''۔

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اعمال کی توفیق، رزق اور مدد نصرت پر اللہ کی بڑائی بیان کرنا (اللہ اکبر کہنا) ایک امرِ شرعی و دینی ہے؛ اِس لیے کہ یہ تین اُمور انسان کے بنیادی اُمور میں سے ہیں، لفظ ''اللہ اکبر'' ایک عظیم کلمہ ہے، جس کہنے کا اللہ نے حکم دیا ہے؛ تاکہ بندوں کے دلوں میں اللہ کی بڑائی اور عظمت پیوست ہوجائے''۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○﴾ (مدثر:۳) ''اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے''۔

تکبیر ایک جامع و بلیغ اور اللہ کے نزدیک محبوب لفظ:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''عربوں کے نزدیک بڑائی، عظمت اور کبریائی کو بیان کرنے کے لیے سب سے بلیغ اور جامع لفظ ''اللہ اکبر'' ہے''۔

لفظ ''اللہ اکبر'' انسان کا فطری لفظ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ''اللہ اکبر، اللہ اکبر'' کہتے ہوئے سنا، تو ارشاد فرمایا: فطری الفاظ ادا کر رہا ہے۔(رواه مسلم عن أنس بن مالكؓ، كتاب الصلاة، باب الامساك عن الاغارة: ۳۸۲)

لفظ ''اللہ اکبر'' اُن الفاظ میں سے ایک ہے جو اللہ کو پسند ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کلمات چار ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ''، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ''، ''لَاإِلٰهَ إِلَّااللّٰهُ'' اور ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ''. (رواه مسلم عن سمرة بن جندب، كتاب الآداب، باب كراهية التسمية بالاسماء القبيحة: ۲۱۳۷)

لفظ ''اللہ اکبر'' کہنا، انسان کی ذات کے لیے صدقہ وخیرات کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہر تکبیر صدقہ ہے، یعنی اللہ اکبر کہنے سے صدقے کا ثواب ملتا ہے۔(رواه مسلم عن أبي ذر، كتاب المسافرين، باب استحباب صلاة الضحىٰ: ۷۲۰)

ملائکہ ذکر کی مجلس کو گھیر لیتے ہیں؛ جب تک اُس مجلس میں سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہا جاتا رہے گا۔(رواه البخاري، عن أبي هريرة، كتاب الدعوات، باب فضل ذكر الله: ٦٤٠٨)

اللہ اکبر، الحمد للہ اور سبحان اللہ یہ کلمات آسمان کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، کہ ایک آدمی نے کہا: ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ كَبِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّأَصِيْلًا''. کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: اِس اِس طرح کے کلمات کس نے کہے؟ ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے کہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے وہ کلمات پسند آئے، ان کلمات کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے ان کلمات کو سنا، اُس وقت سے کبھی ان کلمات کو ترک نہیں کیا۔(رواہ مسلم، کتاب المساجد، باب مایقال بین تکبیرۃ الاحرام: ٦٠١)

تکبیر میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی عمل:

لفظ ''اللہ اکبر'' قیامت کے دن میزانِ اعمال میں سب سے زیادہ وزنی ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پانچ باتیں کیا ہی بہترین ہیں! میزانِ عمل میں کس قدر وزنی ہوں گی: (۱) لا الٰہ الا اللہ (۲) اللہ اکبر (۳) سبحان اللہ (۴) الحمد للہ (۵) نیک اولاد کا انتقال ہوجائے، تو اُس کے والدین کا صبر واحتساب کرنا۔(رواہ أحمد عن مولیٰ لرسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: ١٥٦٦٢)

خلاصۂ کلام:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ بڑے ہیں، اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے، آسمانوں اور زمینوں میں اُسی کی بڑائی ہے، اُس کی عظمت اور بڑائی کی حقیقت کا ادراک، اس کا خیال وتصور عقل کو حیران وششدر کرتا ہے، بندوں کے خیال وتصور میں جو بڑائی آسکتی ہے، اللہ اُس سے بہت بڑے ہیں۔

ساتوں آسمان اُس کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہیں، ساتوں زمینیں اُس کی دو اُنگلیوں کے درمیان ہیں، درخت ایک اُنگلی پر ہے، پانی ایک اُنگلی پر ہے، تحت الثریٰ ایک اُنگلی پر ہے اور تمام مخلوق ایک اُنگلی پر ہے۔(رواہ البخاري في حديث طويل عن عبد اللّٰہ، كتاب التفسير باب وماقدروا اللّٰہ حق قدره: ٤٨١١)

لہٰذا مومن کو چاہیے کہ وہ اللہ کی عظمت وبڑائی سے پناہ حاصل کرے، اُسی پر توکل رکھے، اپنے تمام اُمور کو اُسی کے سپرد کرے، صرف اُسی کو پکارے اور اُسی کی طرف دوڑے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَاقَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ، سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○﴾(الزمر:٦٧)

اللہ کی جیسے قدر کرنی چاہیے، بندے ویسی قدر نہیں کرتے؛ حالاں کہ ساری زمین قیامت کے دن اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہوگی، آسمان اُس کی قدرت سے لپیٹ دیے جائیں گے، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے افن نقائص اور عیوب سے جن کے ساتھ یہ بے ایمان اللہ کی ذات کو متصف کرتے ہیں۔

اللہ کی معرفت کے بغیر کوئی نعمت، سعادت اور کامیابی بندے کو حاصل نہیں ہوسکتی؛ لہٰذا بندے کے لیے اللہ کی معرفت نہایت عزیز اور انتہائی مطلوب چیز ہونی چاہیے۔

کبریائی اللہ کی خاص صفت:

بڑائی اور عظمت اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے، اس کی خاص صفت ہے، جو شخص بڑائی کا دعویٰ کرتا ہے، اللہ نے اُس کو سخت وعیدیں سنائی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"**اَلْعِزُّ إِزَارُهُ، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَاؤُهُ، فَمَنْ يُنَازِعُنِي عَذَّبْتُهُ**". (رواه مسلم عن أبي سعيد وأبي هريرة، كتاب البر والصلّة، باب تحريم الكبر: ٢٦٢٠)

وروى البيهقي بلفظ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: الْعِزُّ إِزَارِيْ، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ، فَمَنْ نَازَعَنِيْ مِنْهُمَا شَيْئًا عَذَّبْتُهُ. (شعب الإيمان، فصل في التواضع: ٧٨٠٨)

''عزت اللہ کا تہبند ہے، بڑائی اُس کی چادر ہے، (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) جو شخص مجھ سے ان کو چھیننا چاہتا ہے، تو میں اُس کو عذاب دوں گا''۔

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کبریائی ایک عظیم اور وسیع صفت ہے، تو اس کو رداء (چادر) کہے جانے کے لائق ہے؛ لہٰذا بندے کو چاہیے کہ وہ زمین میں نہ اِترائے، لوگوں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش نہ کرے، نہ ان پر ظلم کرے، جس شخص کو کچھ قوت، طاقت، منصب اور حکومت ملتی ہے، تو وہ کمزوروں اور ماتحتوں پر ظلم کرنے لگتا ہے، ان سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اس بات کا خیال وتصور کرے، اللہ اس سے بڑا ہے، قدرت اور قہر والا ہے''۔

﴿**فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ○**﴾ (النساء:۳۴)

جس آدمی کو اللہ کی بڑائی اور کبریائی کا یقین اور استحضار ہوگا، اللہ کی عظمت، خشیت اور خوف اُس پر غالب ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرے گا، اُس سے محبت کرے گا، خالص عبادت کرے گا، اُس کے دل ودماغ سے کبر، عجب اور ریاء کاری نکل جائے گی، اللہ تعالیٰ نے جنت اُن لوگوں کے لیے بنائی ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور متواضع ہوتے ہیں؛ چناں چہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿**تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○**﴾ (القصص:۸۳)

''آخرت کا گھر یعنی جنت ہم اُن کے لیے تیار کر رکھا ہے جو دنیا میں بڑائی نہیں کرتے ہیں، نہ فساد مچاتے ہیں، اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے''۔

اصلاحِ معاشرہ

مسجد کی کمیٹیوں سے کچھ گزارشات

ازقلم: مفتی احمد اللہ نثار صاحب قاسمی، ناظم دارالعلوم رشیدیہ وصدر دارالافتاء والارشاد حیدرآباد

مسلم معاشرہ میں مسجد کی حیثیت روحِ اسلامی کی سی ہے، جس کے بغیر اسلامی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ مسجد کے بغیر کسی مسلم بستی کا تصور ممکن ہے، مسجد اہلِ محلّہ وبستی کے ایمان اور اسلام کا پتا دیتی ہے، دنیا کی تمام مساجد بیت اللہ الحرام خانۂ کعبہ کی شاخیں ہیں؛ اِسی لیے ساری مسجدیں ''بیت اللہ'' (اللہ کا گھر) ہیں، جہاں جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے لیے ان بابرکت مساجد کا نظام وہ نظام ہے کہ انسانی عقل اس سے ارفع اور بہتر نظام کو سوچ ہی نہیں سکتی۔

مسجد کی تعمیر اور اس کی خدمت سنتِ ابراہیم وزکریا علیہما السلام ہے، ہر کسی کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی، اور جس کو نصیب ہے اُنہیں اس کی قدر نہیں ہوتی، ہمیشہ اس خوف سے خدمت ہو کہ کہیں محروم نہ کر دیا جاؤں، عہدہ کا لالچ انسان کو ایمان اور حق سے محروم کر دیتا ہے، مکتب اور مسجد کی مخلصانہ خدمت نسلوں کی ہدایت کا دروازہ کھلوا دیتی ہے، کمیٹی کے احباب کو خیر کی چابی بننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہر خیر مسجد سے عام ہو اور ذریعے ہم بنیں، شر کی چابی بننے سے پناہ مانگنی چاہیے، ہم کہیں لوگوں کو ہدایت سے محروم کرنے والے نہ بن جائیں۔

''فَطُوبٰی لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلْخَيْرِ مِغْلَاقًا لِلشَّرِّ، وَوَيْلٌ لِعَبْدٍ جَعَلَهُ اللّٰهُ مِفْتَاحًا لِلشَّرِّ مِغْلَاقًا لِلْخَيْرِ''.

مولانا مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ہمیں جو کرنا ہے سب کا نمونہ اسی پہلی مسجد ''مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' میں قائم کر دیا گیا، ہمیں صرف انہی کاموں کو کرنے کی ضرورت ہے جو سب سے پہلے مسجد میں انجام دیے جاتے تھے..... عمارت کی یہ خاص قسم جس کا نام ''المسجد'' ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کیا ہوا ایک ''نظام'' ہے، یہ مسجد پانچوں وقت کی نماز کی جگہ بھی تھی، اسی میں صفہ کا مدرسہ بھی تھا، اسی میں مسافر بھی ٹھہرائے جاتے تھے اور مقدّمات بھی اِسی عمارت میں طے ہوتے تھے''۔ (اسلام کا نظامِ مساجد:۱۴:۲۲)

اِس لحاظ سے مسجد مسلمانوں کی علمی، عملی، اخلاقی، رِفاہی، عسکری، معاشرتی اور سماجی قیادت گاہ تھی، یہ جہاں

دارالعلوم تھا وہیں دارالقضاء، دارالافتاء اور بیت المال بھی تھا؛ مگر افسوس جوں جوں عہدِ مبارک سے بُعد ہوتا گیا، یہ ساری خوبیاں بکھرتی چلی گئیں۔ واہ! کسی نے بہت خوب کہا: ''إذا الناس ناس و الزمان زمان'' اُس وقت کے لوگ بھی کیسے بہترین لوگ تھے اور زمانہ بھی کیسا بہترین تھا۔

مسجد جس طرح عظمت کے قابل ہے، اِسی طرح خدامِ دین بھی قابلِ عظمت ہیں، ان کا دل وجان سے اکرام واعزاز کرتے رہنا چاہیے، مسجد کے خادمین کو معقول تنخواہ دینا کہ وہ بے نیازی سے گزر بسر کریں، خدمتِ دین وعظمتِ دین میں داخل ہے، حق الخدمت دیے بغیر لوگوں کے صدقات کے حوالے کرنا خلافِ مروّت ہے، معیاری تنخواہ ائمۂ کرام کے اکرام میں داخل ہے، ہمارے رویّے کی وجہ سے مسجد قابل اور دردمند امام وخطیب سے محروم نہ ہوجائے، علماء کی خدمت اپنی نجات کا ذریعہ ہے، مسجد کے رنگ ورغون اور تعمیرات سے زیادہ مقصد پر خرچ کرنے کا جذب ہو، موجودہ زمانہ میں ائمۂ کرام سے زیادہ مجاہدات وقربانی بہت کم لوگوں سے ممکن ہے، غلطی کا امکان ہر شخص سے ہے؛ مگر عقلمند ڈاکٹر سڑک پر آپریشن نہیں کرتا، بے عزت کرنا مسئلہ کا حل نہیں ہے، معزول کردینا اصلاح کا راستہ نہیں ہے، ہر بڑے پر کوئی بڑا ہوتا ہے، جن سے کہلوانے پر اصلاح کی توقّع ہو اُن سے رابطہ کرلینا چاہیے۔

مسجد کے ٹرسٹی ہونے کا مطلب شریعت کا مفتی ہونا نہیں ہوتا ہے، مسجد کی انتظامی ذمہ داریاں بخوبی انجام دیں، دینی اور علمی رہنمائی کا فریضہ امام صاحب پر چھوڑ کر خود بھی دینی مسائل میں امام کی بات مانیں۔

مسجد کی تولیت بڑا اشرف ہے، جو عہدہ جتنا عظیم ہوتا ہے اُس کی ذمہ داری بھی اتنی ہی عظیم ہوتی ہے، ایسے موقع پر معمولی غلطی بھی عظیم شمار ہوتی ہے، تولیت سماجی عہدہ نہیں ہے؛ بلکہ دینی عہدہ ہے، سیاسی عہدوں کی طرح مکاری سے نہیں شرعی عہدے کی طرح جواب دہی کے احساس سے انجام دیا جائے گا۔ کیا یہ بات افسوس ناک نہیں کہ مسجد جیسی مقدس جگہ میں تولیت وکمیٹی دین بیزار؛ بلکہ دین فروش ہو۔

متولی خداپرست ہو نہ کہ خواہش پرست، متولی، صدر یا کمیٹی کا ممبر عالم باعمل نہ سہی دیندار اور دیانتدار ہو، فاسق شخص کو مسجد کی ذمہ داری حوالے نہیں کی جائے گی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''تولیت کا حق متقی مسلمان کو پہنچتا ہے، فاسق وفاجر مسجد کا متولی نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نہیں؛ بلکہ متضاد باتیں جمع ہیں، مسجد خداپرستی کی جگہ ہے اور متولی، صدر خداپرستی کے بجائے خواہش پرست ہے''۔ (مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ: ۹/۱۹۴)

مسجد کی خطابت پر تنگ نظری نہ کی جائے، منکرات پر روک نہ لگائی جائے، اللہ کے گھر سے اگر ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا پیغام عام نہ ہوا تو کہاں توقع رکھی جائے گی؟ لوگوں کے بدک جانے کا خوف نہیں رکھنا چاہیے،

مصلحت پسندی کے خوف اور ہر دلعزیزی کے شوق نے لوگوں کو حق سے محروم کر دیا ہے، اہلِ حق کو خدمت کے میدان سے محروم کرنا دراصل اشاعتِ دین میں رکاوٹ بننا ہے، اس سے بڑی بدبختی کیا ہوگی، امام کو حق بات کہنے کی پوری آزادی دی جائے، امام اگر لوگوں کی اصلاح کی کوئی تدبیر کرے تو مخالفت کے بجائے معاونت کی جائے۔

یہ فکر ہو کہ مسجد کا کامیاب خادم کیسے بنوں؟ جس سے میری بخشش ہو جائے، لوگوں میں شبیہ حاکمانہ نہیں خادمانہ بناؤ، خالی الذہن ہو کر ان صفات کو پڑھنا اور سننا چاہیے، بعض لوگوں کا عجیب حال ہے کہ وہ صالحین سے تو محبت کرتے ہیں؛ مگر مصلحین سے بیر رکھتے ہیں؛ کیوں کہ صالح اپنی ذات میں مگن رہتا ہے؛ مگر مصلح اپنی اصلاح کے ساتھ مخاطب کی اصلاح بھی چاہتا ہے، اور جب اپنے اندر سدھار لا نا نہ ہو تو مصلح کی صلاحیت بھی نظر نہیں آتی ہے۔

کمیٹی کے افراد کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ دینی کتابوں کا مطالعہ اہلِ علم کی روشنی میں ضرور کریں، عموماً محض عصری علوم یافتہ یا جاہل کمیٹیاں مسجد کے پورے نظام کو برباد کر دیتے ہیں، ماضی میں مسلم حکمران جہاں دیگر ممالک کو فتح کرنا ضروری سمجھتے تھے وہیں مفتوح قوم کی کتابیں پڑھنا بھی ضروری سمجھتے تھے، بے علم بادشاہ کو عاجز سمجھا جاتا تھا، حکمران اپنے شہزادوں کے لیے بہترین معلم ایسے رکھتے تھے جیسے تلوار بازی کے لیے استاذ رکھا کرتے تھے۔ تنہائی کا مطالعہ بعض مرتبہ وہ اثر کرتا ہے جو سالوں کی تقریر نہیں کر پاتی۔

عہدِ نبوت میں امام اور مؤذن کی تقرری کا ثبوت تو ملتا ہے؛ مگر علاحدہ سے کسی انتظامیہ کا وجود نہیں ملتا؛ کیوں کہ اس زمانہ میں ایسے انتظامی ہنگامے نہیں تھے جو آج کل دیکھے جا رہے ہیں؛ البتہ خادم کا وجود ثابت ہے جو رضا کارانہ طور پر صفائی کر لیا کرتے تھے؛ زمانہ گزرتے گزرتے انتظامی کمیٹی بھی مستقل شعبہ کی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

ضرورتِ دین میں مخلص ہونے کے ساتھ تربیت اور صحبت یافتہ بھی ہونا چاہیے؛ ورنہ جس طرح بندر نے اپنے انسان دوست کے ناک کی مکھی اُڑانے کے لیے تلوار سے ناک ہی ختم کر دی اور تالاب میں اُچھلنے والی مچھلیوں پر رحم کھا کر بندر نے مچھلیوں کو تالاب سے باہر نکال پھینکا، دونوں جس طرح روح و جان لیوا ہیں، اِسی طرح مساجد کی روح اور جان ختم کرنے والے نااہل کمیٹیاں ہیں جو اُصولِ شرع کی پابندی نہ کرتے ہوں؛ مگر افسوس آج کل نااہل متولیوں، صدور اور غیر تربیت یافتہ کمیٹیوں کی وجہ سے نااہل ائمہ کی بھرمار نظر آتی ہے اور مساجد میں بدنظمی بخوبی دیکھی جا رہی ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ تمام صدور و متولی بگڑے ہوئے نہیں ہوتے ہیں، جہاں دیگر شعبہ جات میں بہترین لوگ ہیں وہیں اس شعبہ میں بھی بہترین متولی و صدر پائے جاتے ہیں جو بعض ائمہ سے بھی بہتر کہلائے جانے کے مستحق ہوتے ہیں؛ البتہ اِس طبقہ میں اکثر سر پھرے لوگ ہی دیکھے گئے ہیں، جن کی دُکھتی رَگ پر ہاتھ رکھنا بہت ضروری ہے۔

ہر اَیرے غیرے کی شکایت پر امام صاحب کو تنبیہ کرنے اور بات بات پر ان کو ٹوکنے کا مزاج جاہلانہ مزاج

ہے، مسجد کے ہر مصلّی ؛ بلکہ ہر ذمہ دار کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ امام صاحب پر حکم چلائے، اپنی مرضی کے کام پر لگائے، یا کوتاہیوں کی اصلاح کرتا پھرے۔ مہذب اور سلیقے سے گفتگو کرنے والا شخص ہی بات کرے، لوگوں کا عجب مزاج بنا ہوا ہے کہ جن کے گھر میں ان کی بیوی بھی ان کی نہیں سنتی وہ بھی امام پر رعب جماتے ہیں۔

بعض لوگ امام پر اتنی کڑی نظر رکھتے ہیں کہ اپنی اولاد کی کوئی بُرائی ان کو نظر نہیں آتی ؛ کیوں کہ ان کی نظر میں اولاد فرشتہ ہیں اور امام سے ہی غلطیاں ہوتی ہیں، حتیٰ کہ لڑکیوں کے ارتداد پر بولنا خراب لگتا ہے؛ مگر محلّہ کی بٹیاں غیروں کا بستر گرم کریں یہ خراب نہیں لگے گا، اگر خراب لگتا ہے تو جس طرح امام کے سامنے جرأت دکھائی جاتی ہے ویسے وہاں کیوں نہیں دکھائی جاتی ؟

افسوس کہ آج بہت سے لوگ امامِ مسجد اور مؤذن کو بدنام کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، چھوٹی غلطی بھی مجمع میں بیان کر کے اپنا رعب جمانا چاہتے ہیں، یہ خیال تک نہیں رہتا کہ اگر میرے باپ کی غلطی یا بیٹے کی غلطی ہو تو کیا میں ایسے ہی اصلاح کرنا پسند کروں گا ؟ اور میری اس حرکت سے میں لوگوں کو ائمۂ کرام، سے دُور کر کے باطل کا ساتھ دے رہا ہوں۔ یاد رہے کہ یہ غیر مسلموں کا طریقہ ہے، بعض مرتبہ تعجب ہوتا ہے قوم کی بے حسی پر کہ جب امام صاحب حق پر ہیں تو ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے اور ان کا ساتھ دے کر ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی کرنے کے بجائے ظالموں کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

کیا مسجدوں کے امام اور مؤذن اس معاشرے کا حصہ نہیں ہیں؟ کیا ہمارا معاشرہ اپنے امام ومؤذن کو ان کا مقام دے رہا ہے.....امام کو ایک مزدور سے بھی کم تنخواہ دیتے ہیں.....ایک ٹیچر سے بھی کم تنخواہ دیتے ہیں..... ٹیچر کو ریٹائر ہونے کے بعد تاحیات پنشن ملتی ہے، اسپتالوں میں علاج کی سہولت مفت میں وغیرہ؛ مگر امام مزدور سے کم تنخواہ میں بچوں کی پرورش، پڑھائی لکھائی اور علاج ومعالجہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ **الأمان الخفیظ** اپنی اپنی ذمہ داریوں سے متعلق شرعی رہبری عظیم نعمت ہے۔

ایک ضروری وضاحت:

بالعموم انسانی مزاج یہ ثابت ہوا کہ ماتحت سرپرست کی اور سرپرست ماتحت کی خامیاں اور کوتاہیاں دیکھتا ہے، اور ہر شخص ایک دوسرے سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے، بروقت ایک دوسرے کا حق ادا کرنے کی فکر نہیں کرتا، دونوں خدامِ مسجد ہونے کے باوجود شکایتوں کا طوفان ختم نہیں ہوتا، بہت کم کمیٹیاں اور ائمۂ کرام ایسے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ ہو، زیرِ نظر کتاب کمیٹی، صدر، ممبر اور مصلیوں کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے، اس وجہ سے نہیں کہ ائمۂ کرام کا طبقہ بالکل فرشتہ صفت ہے، انہیں کسی تربیت کی صرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس وجہ سے

کہ تمام کمیٹیاں قابلِش ملامت ہی ثابت ہوئی ہیں، کہ مجرمانہ تصور کے ساتھ مخاطب بنایا جائے؛ بلکہ تذکیر کے طور پر چند اہم ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے؛ چوں کہ مسجد کی کمیٹی کا ممبر یا صدر یا متولی بننے والے احباب کسی دارالافتاء سے یا ادارے وعالم سے اپنی متعلقہ ذمہ داریاں سیکھ کر عہدے پر نہیں آتے ہیں، اور بالعموم آپ حضرات کو کوئی مخاطب کر کے آپ کی اپنی ذمہ داریاں بتائے تو جاننے کی فکر بھی نہیں دیکھی گئی ہے؛ چوں کہ آپ کے ذمہ مالیات کا شعبہ متعلق ہوتا ہے، تو خواہ اپنی جیب کی رقم دینا نہ ہو؛ مگر مالی واسطہ تعلّی پیدا کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے بندہ اپنے کو بعض مرتبہ تربیت سے ماوراء سمجھ لیتا ہے، جب کہ ائمۂ کرام اپنے اساتذہ وغیرہ سے اپنی ذمہ داریاں پھر بھی سن لیتے ہیں، علاوہ ازیں ائمۂ کرام سے متعلق علاحدہ کتاب جو اس سے بھی ضخیم ہے مرتّب کی جا چکی ہے، اہلِ علم وعلماء سے کئی بار آپسی مذاکرات بھی ہوئے ہیں، یہاں آپ حضرات سے متعلق اہم اُمور پر گفتگو کی گئی ہے، جو نہایت عرق ریزی کے ساتھ جمع کی گئی ہے، اور اس قدر اُمور پر جامع کتاب بہت کم دستیاب ہے[1]، اس لیے آپ حضرات کو اپنی آخرت کی خاطر ان اُمور کی قدر جان کر اپنے معمول میں لانے کی حتی الامکان کوشش ضرور کر لینی چاہیے؛ تاکہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر دونوں میں فاصلے اور دُوریاں کم ہو جائیں۔

یہ بات یاد رہے کہ ہم علمائے کرام نہ آپ کے دشمن ہیں اور نہ ہی آپ کے دنیوی حاجت کے گستاخ ومنکر، چند کمیٹیوں کی بداخلاقی اور بدتمیزی کی وجہ سے مکمل شعبہ بدنام ہو چکا ہے، ایسے میں چاول کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں، دنیوی وجاہت والے کا اکرام کرنا ''قُوْمُوْا لِسَیِّدِکُمْ'' اور ''أَنْزِلُوْا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ'' کے تحت ہم پر بھی ضروری ہے، آپ سے متعلق ذمہ داری پورے احترام وعزتِ نفس اور دارین کی خیر خواہی میں مرتّب کی گئی ہیں، اور اسی نیت سے بھی مخاطب کیا جا رہا ہے، آپ اور ائمۂ کرام اللہ کے گھر کی عظیم خدمت کی سعادت حاصل کر کے اللہ کو پانے کی کوشش میں ہیں، یوں سمجھیں کہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں؛ اِس لیے ہمارے آپس میں کسی طرح کا بعد اور بیر نہیں رہنا چاہیے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں، ایک دوسرے کے ملازم نہیں ہیں، مقتدی کے بغیر امامت کیسی؟ امام کے بغیر جماعت کی نماز کیسی؟ مسجد کے سارے انتظامات کا مقصود نماز باجماعت ہے، جس کا ذمہ دار امام ہے، اور نماز باجماعت کے لیے ضروری درجہ کا انتظام بھی ضروری ہے۔

❑❖❑

(۱) مذکورہ جملوں سے صرف کتاب کی اہمیت کو اُجاگر کرنا مقصود ہے، مرتّب کے کمال کو بتانا ہرگز مقصود نہیں ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ کسی بھی نیکی میں انسان کی حیثیت صرف واسطہ کی ہوتی ہے، خدائے تعالیٰ اپنے فضل سے جس سے چاہے کام لے لیتے ہیں، بندہ کو مغرور نہیں بننا چاہیے، ہمارا مقصود رضائے الٰہی بنانے میں ہی عافیت ونجات ہے۔

اصلاحِ معاشرہ (قسط ہشتم)

قلب کو اخلاقِ محمودہ سے مزین کرنے کا بیان

ازقلم: مفتی محمد سلطان خان قاسمی، امام وخطیب مسجد ابوبکر صدیق، ڈی جے ہلی، بنگلور

پچھلی قسط میں لباس، مکان اور اثاث البیت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ طیبہ کی روشنی میں زہد کے اعلیٰ درجہ کو بیان کیا گیا تھا کہ کس طرح ان اولوالعزم ہستیوں نے مذکورہ اسبابِ زندگی میں زہد کو اپنایا تھا۔

اب مندرجہ ذیل قسط میں نفسِ زہد کے درجات کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱) نفسِ زہد کا ادنیٰ درجہ

ایک تو یہ کہ نفس دنیا کی طرف مائل ہو؛ مگر اُس کو جبراً بے التفات بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے۔ اِس حالت کو زہد کہنا تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتا؛ البتہ اگر تزاید کہا جائے اور زہد کی ابتدا سمجھا جائے تو مناسب ہے۔ (تبلیغ دین: ص/۱۸۰، ترجمہ: الاربعین فی اُصول الدین: ص/۳۶۵)

نفسِ زہد کا دوسرا درجہ

یہ ہے کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس طرف مائل ہی نہ ہو اور سمجھ جائے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا یکجا ہونا چوں کہ ناممکن ہے؛ اِس لیے آخرت کی لذتوں کو حاصل کرنے میں دنیا کے مال ومتاع پر اِس طرح خاک ڈال دینی چاہیے جس طرح کسی بیش بہا جوہر کے خریدنے میں چند روپئے خرچ کرنے میں دریغ نہیں ہوتا، اِسی طرح روپیہ دے کر مال ومتاع خرچ کر کے بڑی مسرت کے ساتھ آخرت کی نعمتیں حاصل کر لی جائیں، اور یہی علامت زاہد کی ہوتی ہے کہ وہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو حقیر سمجھ کر اس کو خرچ کر دیتا ہے؛ تاکہ آخرت کی نعمتیں حاصل ہو سکیں۔ (تبلیغ دین: ۱۸۰، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ۳۶۵)

دنیا کی رغبت ونفرت دونوں کا جمع کرنا کمال کا زہد ہے

تیسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا کے مال ومتاع کا عدم اور وجود برابر ہو جائے اور یہ خیال رہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں

ہے وہ حق تعالیٰ کے بے شمار خزانوں کے بحر ذخائر اور دریائے ناپیدا کنار کا ایک قطرہ ہے، پس اگر مل جائے تو کچھ مسرت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت بھی نہیں، اِس درجہ میں نہ تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفر ہوتا ہے اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے۔

(تبلیغ دین:۱۸۰، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین:۳۶۵-۳۶۶)

دنیا کی مذمت کرنا بھی دنیا سے محبت کی علامت ہے

کیوں کہ تنفر بھی ایک قسم کی توجہ ہے اور اس شئے کے باوقعت ہونے کی علامت ہے؛ اِس لیے کہ جس شئے کی وقعت ذہن سے نکل جایا کرتی ہے اُس کی دونوں جانبیں یعنی تنفر اور توجہ برابر ہوجایا کرتی ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہ عدویہ کی مجلس میں لوگوں نے دنیا کی مدمت بیان کرنی شروع کی، تو آپ نے فرمایاہ: دنیا کی قدر ومنزلت تمہارے دلوں میں ہے، جب ہی تم اس کی مذمت کررہے ہو۔ (تبلیغ دین:ص/۱۸۰، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین:ص/۳۶۶، ورواه ابن أبي الدنيا في "ذم الدنيا": ۴۶۴، بحوالہ: حاشیۃ الاربعین فی اصول الدین)

جب دنیا کی وقعت قلب سے جاتی رہتی ہے تو رغبت اور نفرت دونوں سے انسان خالی الذہن ہوجاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک لاکھ درہم آئے اور آپ نے اُن سے نفرت نہیں کی؛ بلکہ لے لیا اور اسی دن مساکین پر تقسیم فرما کر خرچ کردیے، آپ کی خادمہ نے عرض کیا کہ: اے اُمّ المؤمنین! ایک درہم کا گوشت تو خرید لیتیں، جس سے آپ روزہ افطار فرمالیتیں، تو آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ: اگر پہلے یاد دلاتی تو یہ بھی کر لیتے اب تو کچھ باقی نہیں رہا۔ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وحمل إلٰى عائشة رضي اللّٰه عنها مئة ألف درهم، فلم تنفر عنها ولكن فرّقت في يومها، فقالت خادمتها: لواشتريت بدرهم لحما تفطرين عليه؟ فقالت: لوذكرتني..... لفعلت. (الاربعین فی اصول الدین:ص/۳۶۶) (ورواه ابن سعد في طبقاته: ۶۶/۱، وأبو نعيم في "الحلية": ۴۷/۲ بحوالہ: حاشیۃ الاربعین فی اصول الدین)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اِس عمل میں دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) آپ نے ہدیہ کو قبول فرمالیا، اس سے نفرت نہیں کی؛ بلکہ سارا مال لوگوں میں، ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا، یہ درجۂ غنا کہلاتا ہے۔

(۲) زہد کہ آپ رضی اللہ عنہا اُس دن روزہ سے تھیں؛ لیکن اِس بات کا خیال تک بھی نہ آیا کہ آج افطار کے لیے ایک درہم ہی اٹھا کر رکھ لیتیں، جب خادمہ نے یاد دہانی کی تو نہ پورے مال کے خرچ ہوجانے کا افسوس

تھا اور نہ ہی خود کے لیے ایک درہم ذخیرہ کرنے کا غم ہوا، اِسی کو حضرت امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اکمل الزہد'' بتایا ہے۔ (مرتّب)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

پس ناعاقبت اندیش جاہل صوفی دھوکہ کھاتے اور اپنے مال کی بڑھوتری وحرص کو غنا کا درجہ سمجھ جاتے ہیں، یعنی یوں خیال کرتے ہیں کہ چوں کہ ہمارے قلب کو دنیا سے علاقہ نہیں رہا؛ اِس لیے ہمیں یہ مال ومتاع کی کثرت مضر نہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ خیال شیطانی دھوکہ ہے، امتحان کرنے سے اُس کی کھوٹ معلوم ہوجائے گی، مثلاً: اگر سارا مال یک لخت چوری ہوجائے تو دیکھو اُن کا حال کیا ہوتا ہے؟ اگر اپنا مال چوری ہوجانے کا اسی قدر افسوس ہے جتنا کسی اجنبی کا مال چوری ہوجانے سے ہوتا ہے، تب تو سمجھو کہ بیشک اُن کے قلب کو مال سے محبت نہیں ہے، اور اُن کے نزدیک مال کا رہنا اور چلا جانا دونوں برابر ہیں؛ ورنہ قلب کی چوری پکڑی گئی۔

(تبلیغ دین: ص/۱۸۱، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ص/۳۶۶)

زہد کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ زہد سے بھی زہد ہوجائے

یعنی دنیا سے اتنی بے رغبتی کہ اس کا خیال بھی نہ آئے اور دنیا کی جانب سے بے التفاتی کو بھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھے؛ بلکہ یوں سمجھے کہ دنیا کوئی چیز بھی ہے جس کا چھوڑنا ہمت اور بہادری سمجھی جائے یا مسرت کی نگاہ سے دیکھا جائے اُس کی تو اہلِ بصیرت کے نزدیک اتنی بھی قدر نہیں ہے جتنی کسی بڑے بادشاہ کے نزدیک ایک پیسے کی قدر ہوا کرتی ہے، اس بے حیثیت دنیا کو چھوڑ کر یہ سمجھنا کہ ہم نے کچھ چھوڑ دیا حقیقت میں اس کے درجہ کا اس کی حیثیت سے بڑھانا ہے۔

ایک عمدہ مثال

اِس کی مثال ایسی سمجھو، جیسے: کوئی شخص شاہی دربار میں داخل ہونا چاہے اور اُس کو دروازے پر بیٹھا کتا داخلہ سے روک رہا ہو، پس یہ اُس کے سامنے ایک روٹی کا ٹکڑا ڈال دے؛ تاکہ کتا اُس کے کھانے میں لگ جائے اور یہ اپنے مطلوب کے لیے دربار میں جا داخل ہو، اسی طرح شیطان حق تعالیٰ شانہٗ کے دروازے کا کتا ہے، جو سالک کو مطلوب تک پہنچنے سے روک رہا ہو اور ساری دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے، جس کو اُس کے سامنے ڈال کر سالک اپنے مطلوب تک پہنچنے کا راستہ صاف کرلیا ہے، بس تم ہی سوچو کہ شاہی

دربار کی حاضری کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے جو کتے کو روٹی کا ایک ٹکڑا ڈالا گیا ہے نہ اُس کے ذہن میں وقعت ہوگی اور نہ اُس کو قابلِ ذکر وخیال امر سمجھا جاوے گا؛ بلکہ روٹی کے ٹکڑے اور دنیاوی بادشاہ میں تو کچھ مناسب بھی معلوم ہوتی ہے کہ دونوں ایک دن فنا ہو جائیں گے، پس فانی شئ کے حصول کے لیے ایک فانی شئے کا ہاتھ سے کھو دینا جب وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تو دنیا اور آخرت میں کوئی مناسب ہی نہیں ہے؛ اِس لیے کہ اگر دنیا لاکھوں بھی ہوں گی تو وہ بھی ایک دن فنا ہو جائیگی، پس آخرت کی جاوید نعمتوں اور اس پائیدار ملک کی دائمی سلطنت حاصل کرنے کے لیے اگر دنیا کو ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے اور شیطان کے حوالہ کر دیا جائے تو اس کا خیال اور ذکر ہی کرنا فضول ہے۔ (تبلیغ دین: ص/۱۸۲، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ص/۳۶۷)

زہد کے اسباب

حضرت حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں زہد کے اسباب کو بیان کیا ہے، زہد کے اسباب متعدد ہیں؛ کیوں کہ کبھی تو دوزخ کا خوف اور عذاب کا اندیشہ زہد کا سبب بن جاتا ہے اور اس کو خائفین کا زہد کہتے ہیں۔ اور یہ سالکینِ طریقت کے نزدیک ادنیٰ درجہ ہے (۲) اور کبھی اُخروی نعمتوں اور لذتوں کی رغبت کا باعث ہو جاتی ہے اور اس کو راجین کا زہد کہتے ہیں، اور یہ درجہ پہلے درجہ سے بڑھا ہوا ہے؛ کیوں کہ رجاء یعنی اُمید محبت کو مقتضی ہے۔

جملہ ماسوی اللہ سے زہد ہونا اعلیٰ زہد ہے

تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ ہے کہ ماسوی اللہ کی جانب سے بے توجہی اور نفس کا غیر اللہ کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دینا زہد کا باعث ہو، اس کو حقیقی زہد کہتے ہیں؛ کیوں کہ پہلے دونوں درجوں کے زہد تو ایسے ہی ہیں کہ جیسے کسی نافع سودے کی خرید وفروخت ہوتی ہے کہ ایک حقیر چیز کو اس لیے چھوڑ دیا کہ تکلیف دینے والی روح فرسا مصیبت اس کی وجہ سے دفع ہو جائے یا اس سے بہتر اور نافع چیز ہاتھ آجائے اور اس درجہ میں ماسوی اللہ کی جانب التفات کرنے ہی کو فضول سمجھا گیا ہے؛ کیوں کہ وہ کوئی چیز ہی نہیں۔

پس اس درجہ میں حق تعالیٰ کے سوا جو چیز بھی ہو خواہ وہ مال یا جاہ ہو یا اور کوئی ایسی شئ جس سے عموماً لذت حاصل ہوا کرتی ہے سب ہی سے زہد حاصل ہوتی ہے اور بعض سے نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے ان درجوں کے ضعیف ہونے کی؛ کیوں کہ انسان کو جاہ کی محبت مال کی بہ نسبت زیادہ ہوا کرتی ہے اور جس کی محبت زیادہ ہو اُس سے زہد حاصل ہونا قابلِ اہتمام وجہ بھی ہے۔ (تبلیغ دین: ص/۱۸۲، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ص/۳۶۷)

زہد اور فقر کا فرق

آگے حضرت رحمہ اللہ نے زہد اور فقر کے مابین فرق کو بیان کیا ہے۔

زہد کے معنیٰ یہ ہیں کہ: باوجود دنیا حاصل کر سکنے کے دنیا سے ایسا بے التفات ہو جائے کہ دنیا اس کے پیچھے بھاگے اور یہ اُس سے دامن چھڑائے اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ یہ دنیا کو حاصل کرنا چاہے؛ مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو اس کو زہد نہیں کہتے؛ بلکہ اس کا نام فقر ہے اور فقر کا درجہ زہد کے برابر نہیں ہے، ہاں! فقر کو تونگری پر فضیلت ضرور ہے؛ کیوں کہ تونگری میں دنیا کی لذتوں سے دل بستگی ہو جاتی ہے اور اس لیے مرتے وقت ان مرغوبات کے چھوڑنے سے حسرت ہوا کرتی ہے اور دنیا گویا جنت معلوم ہوتی ہے اور آخرت قید خانہ۔

برخلاف فقر کے، کہ اس حالت میں لذتوں سے اگرچہ جبراً قہراً باز رکھا گیا ہے، تاہم چوں کہ کسی چیز کا ذائقہ اور مزہ کبھی منھ کو نہیں لگتا، اس مرتے وقت کسی چیز کی محبت دل میں نہ اٹکائے گا؛ بلکہ دنیا کو دارِ آلام اور تنگ دستی کا گھر سمجھے گا اور آخرت کی آزادی وخوش عیشی کا گھر اور جنت معلوم ہوگی۔

(تبلیغ دین: ص/۱۸۳، ترجمہ از: الاربعین فی اصول الدین: ص/۳۶۸، مترجم: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ)

اصلاحِ معاشرہ

فلسطین تاریخ کے آئینہ میں

ازقلم: محمد عبداللہ مہاراشٹر، متعلّم دارالعلوم دیوبند

وہ ارض مقدسہ جسے انبیاء کا مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کے اِردگرد برکت ہی برکت کا نزول ہے، جہاں سے پیغمبرِ آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم روح القدس کے ہمراہ سفرِ معراج کے لیے پابہ رکاب ہوئے، جس دھرتی پر سیدالثقلین صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیوں کی امامت کرا کے امام الانبیاء کا لقب پایا، جی ہاں وہی پُرعظمت وپُرشوکت زیتون کے درختوں سے آراستہ وپیراستہ سرسبز وشاداب بقعۂ ارضی، جہاں اسلام کی عظمتِ رفتہ اور جنت گم گشتہ کا نشان قبلۂ اوّل کی صورت میں موجود ہے، جس کے فاتحِ اوّل فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ تھے، جس کے درودیوار نے ایوبی تکبیر سنی تھی، جہاں خیر کا نور پھیلانے والوں اور شر کی تاریکی میں اضافہ کرنے والوں کے درمیان آخری؛ مگر عظیم معرکہ بپا ہونے کا میدان سج چکا ہے، آج طاغوتی قوتوں کے زیرِ نگیں وقبضہ میں ہے اور یہ طاغوتی حکومت ان مظلوموں اور نہتے مسلمانوں پر دن بہ دن بمباری کرتی جارہی ہے، گویا کہ ظلم وبربریت کا نیاباب رقم کررہی ہے، اس کے باوجود بھی دنیا کے جدید ترین اسلحہ سے محروم فلسطینی مسلمان صیہونیوں سے بتدریج قدم بقدم مقابلہ کررہے ہیں۔ ؎

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ تو کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

کی زندہ مثال بن کر اوروں کے لیے نشانِ راہ فراہم کرنے والے، پتھروں سے توپوں کا مقابلہ کرتے ہوئے، اپنے ہتھیار اسی قسم کے بنالیے کہ اس کے سامنے ملین ڈالر کے ہتھیار بھی ماند پڑرہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی سُپر پاور طاقت کو سرنگوں کرتے نظر آرہے ہیں۔

فلسطین کی جائے وقوع:

محل وقوع کے اعتبار سے فلسطین برِّ اعظم ایشیاء کے مغرب میں بحرمتوسط کے جنوبی کنارے پر واقع ہے، اس علاقے کو آج کل مشرقِ وسطیٰ بھی کہا جاتا ہے، شمال میں لبنان اور جنوب میں خلیج عقبہ واقع ہے، جنوب مغرب

میں مصر اور مشرق میں شام اور اُردن سے اس کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں، جب کہ مغرب میں بحر متوسط کا ساحل طویل ہے، فلسطین کا رقبہ حفہ اور غزہ سمیت ۲۷؍ ہزار کلومیٹر پر مشتمل ہے۔

فلسطین کے طبعی جغرافیائی علاقوں میں فلسطین کا طویل ساحل جو ناقورہ سے لے کر رفح تک جنوب میں پھیلا ہوا ہے، سرفہرست ہے، جس کا عرض ۱۶؍ سے ۱۸؍ کلومیٹر تک ہے، اسی ساحل کے مشہور شہروں میں طولکرم، خان یونس، مرملہ، عکا، یفا، یافا اور غزہ ہیں، اسرائیل نے اپنا دارالحکومت بھی یافا کے شمال میں بنایا ہے، جب کہ پہاڑی سلسلوں میں نابلس، کرمل، خلیل اور القدس کے پہاڑی علاقے مشہور ہیں، واضح رہے کہ خلیل پہاڑوں میں سب سے اونچا پہاڑ جبلِ طور ہے، جس میں بیت المقدس کا علاقہ واقع ہے مسجدِ اقصی اور قبۃ الصخرہ بھی اسی شہر کی زینت و رونق ہیں، میدانی علاقوں میں نقب اور اغوار کے علاقے شامل ہیں، اغوارِ فلسطین کا مشرقی علاقہ ہے، جسے دریا اردن کاٹتا ہے اور بحر میت بھی اس کے کنارے واقع ہے، اس علاقے میں اریحا نامی شہر ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کے قدیم ترین شہر ہے۔

فلسطین اپنی تاریخ کے ابتدائی دَور میں کنعانیوں کا مرکز رہا ہے، ان علاقوں میں جتنے قدیم شہر تھے، وہ سارے کنعانیوں نے ہی آباد کیے تھے، کنعانی قبیلے کی اہم شاخ ''یبوسی'' قوم نے القدس شہر بسایا تھا، کنعانی دَور کے بعد عبرانی دَور کی باری آتی ہے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ارضِ کنعان کی طرف ہجرت فرمائی، بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعہ آپ کی اولاد مصر کی حکمراں بنی پھر بتدریج قبطی ان پر غالب آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مصر سے نکالا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں ان عبرانیوں نے کنعان کو فتح کیا، یہاں سے عبرانی دَور کا آغاز ہوا، عبرانیوں کے حکمرانوں میں دو جلیل القدر پیغمبر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام گزرے ہیں۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں)

غرض یہ کہ فلسطین کی اہمیت اسلام اور مسلمانوں کے لیے اِس حوالے سے بہت واضح رہے ہے کہ ابتدائے اسلام میں یہ ان کا قبلۂ اوّل رہا ہے، اِس وجہ سے رومیوں کے ساتھ معرکے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں شروع ہو گئے تھے، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری لشکر جیشِ اُسامہ رومیوں کے مقابلہ کے لیے ترتیب دیا ہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اِس دنیا سے رحلت فرما گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے روانہ فرمایا، ارتداد کی مہم سے فارغ ہو کر خود بھی اِس جانب توجہ دی، یہاں تک کہ ۱۶ھ میں سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں بیت المقدس مسلمانوں کے زیرِ قبضہ آ گیا۔

چھٹی صدی ہجری میں بلادِ اسلامیہ پر صلیبیوں نے حملہ کیا، جس کے نتیجے میں فلسطین میں صلیبی حکومت قائم کر لی گئی، طاقت اور قوت کے بل بوتے پر ستر ہزار مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا؛ لیکن صلیبیوں کی یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہوسکی، مشہور مجاہد صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد ہی بیت المقدس کو صلیبی پنجۂ استبداد سے واکرالیا، ۲۷/رجب المرجب ۵۳۸ھ کو بیت المقدس دوبارہ تکبیر کے زمزموں سے گونج اٹھا۔

جس وقت عالمِ اسلام کو استعماری طاقتوں نے اپنی شازشوں کا ہدف بنایا اور فلسطین کی سرزمین برطانیہ کے استعماری قبضہ میں آنے لگی، تو مکار اور شاطر یہودیوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اس خطہ کے حصول کی خاطر کوششیں تیز کردیں، ۱۸۳۹ھ میں سب سے پہلا مغربی سفارتخانہ جو بیت المقدس میں کھلا وہ حکومتِ برطانیہ کا تھا، جس کا واحد مقصد یہودیوں کی خدمت گزاری تھا، اس کے ساتھ ہی پوری دنیا سے یہودیوں کو بیت المقدس میں جمع کرنا شروع کردیا گیا، اس وقت پورے فلسطین میں صرف نو ہزار کے قریب یہودی تھے۔

۱۲۲۲ھ مطابق ۱۵۱۶ء میں فلسطین ترکوں کی علم داری میں آگیا اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے تک سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ رہا، آخری عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید خان تھے، یہودیوں نے ان کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے مختلف سطحوں پر ساز باز شروع کی، جس میں بھاری رقوم دے کر ترکوں کو خریدا گیا، خود خلیفہ عبدالحمید کو لالچ دیے گئے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ترکی کے یہودیوں کا ایک وفد سلطان سے ملا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین اگر یہودیوں کو دے دیا جائے تو اس کے بدلے ہم خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت رہ کر خلافت کے سارے قرضے اُتار دیں گے، جواب میں سلطان نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر ان کو دکھایا پھر فرمایا: ''اگر فلسطین کا اتنا حصہ بھی تم لینا چاہو گے تو نہیں ملے گا''۔

جب ۱۹۰۹ء میں سلطان عبدالحمید کا انتقال ہوا تو گویا اس دن سے اسرائیل کے وجود کی بنیاد پڑ گئی، حکومت میں موجود صیہونیت نواز لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو برابر یہودیوں کو فلسطین منتقل کرنے میں مدد دیتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۹۷ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار تھی اور یہی تعداد ۱۹۱۴ء میں ۸۵/ہزار ہوگئی۔ اس کے بعد یہودیوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ہر طرح اور ہر سطح پر دباؤ میں رکھنے کی کوشش کی اور دنیا کو باور کرایا کہ فلسطین کا حصول یہودیوں کے لیے ناگزیر ہے؛ لیکن خلافتِ عثمانیہ ان کے باطل عزائم اور ارادوں کے سامنے سدِ سکندری ثابت ہوتی رہی؛ چناں چہ اس بے حقیقت مفروضے کی بناء پر حکومت مصر کے توسط سے صحرائے سینا میں یہودیوں کو بسانے کی ایک مرتبہ کوشش بھی کی گئی، جس میں وہ ناکام ہوئے، اس کے بعد دنیا میں کچھ ایسے حالات آئے جو فلسطین کی بدی کی ''نمائندہ قوم'' کے لیے قیامِ حکومت کی راہ ہموار کرتے چلے گئے۔ جن میں چار حالات کا

بطورِ خاص ذکر معلوم ہوتا ہے: (۱) دو عالمی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا۔ (۲) ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا قتلِ عام، جس سے وہ دنیا کے سامنے اپنی مظلومیت ثابت کر پائے۔ (۳) خلافتِ عثمانیہ کا سقوط۔ (۴) فلسطین کا برطانوی اشعار کے زیر دست ہو جانا۔

آخر الذکر سبب کے تحت برطانوی استعمار نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے حتی المقدور تعاون کیا، مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا، یہودی بستیاں آباد کی گئی، تِل اَبیب کو مضبوط کیا، یہودیوں کے استحکام سے مطمئن ہو کر خود ۱۴ر مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے نکلنے کا اعلان کیا، جاتے جاتے اہم مقامات، سرکاری دفاتر، ہوائی اڈے یہودیوں کو بطور ہدیہ دے گئے، جب کہ مسلمانوں کا جانی مالی اور اقتصادی استحصال کیا گیا، جس کے نتیجے میں کچھ قتل ہوئے اور اکثر ہجرت پر مجبور ہوئے۔

یوں ۱۵ر مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل مملکت کا اعلانِ قیام ہوا، جسے چند ہی لمحوں میں امریکہ، روس، پھر رسیا نے تسلیم کر لیا، اسلامی ممالک میں صرف ترکی اور اس وقت کے شاہِ ایران نے یہ ناجائز ریاست تسلیم کرنے پر اپنے فکری ضلالت پر مہر تصدیق ثبت کی۔

حاصل یہ کہ فلسطینی مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی میں عربوں کا کوئی رول نہیں رہا، وہ یہودیوں اور برطانیہ سے مذاکرات اور معاہدے کرتے رہے، اگر عرب خلافتِ عثمانیہ کو کمزور نہ کرتے تو شاید اتنی آسانی سے برطانیہ کا قبضہ فلسطین پر نہ ہوتا، عربوں نے جس عرب قومیت کا نعرہ لگایا تھا تو فلسطین اُن کی مدد کے زیادہ مستحق تھے؛ کیوں کہ فلسطین عربوں کا علاقہ تھا اور وہاں کے مسلمان عرب تھے، اس پوری تاریخ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عیسائیوں نے اسرائیل کے قیام میں اپنی پوری قوت لگا دی، آج بھی وہ اس کی پشت پر کھڑے ہیں، امریکہ روس اور پورا یورپ اس کے ساتھ ہے، اقوامِ متحدہ اور لیگ آف نیشنز نے بھی اس کی پشت پناہی کی ہے، اقوامِ متحدہ نے آج تک مسلمانوں کے کسی بھی مسئلے کو حل نہیں کیا ہے؛ بل کہ اسے مزید پیچیدہ بنایا ہے۔ ان حالات میں ہمیں اپنے دشمن کو پہچاننا چاہیے اور خود اپنی طاقت اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ حماس اس کی زندہ مثال ہے، حماس کے جیالوں نے جس پامردی کا مظاہرہ کیا اور سُپر پاور اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا، اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ حماس نے پھر ثابت کر دیا ہے کہ جنگ حوصلوں اور قربانی دے کر لڑی جاتی ہے، ہمارا یقین ہے کہ بیت المقدس ایک دن ضرور آزاد ہوگا اسی طرح، جس طرح صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ آزاد ہوا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور دشمن ان کو نقصان نہ پہچا سکے گا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا

وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا: بیت المقدس اور اُس کے اِردگرد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دنیا ختم ہونے میں ایک دن باقی رہے تو اللہ تعالیٰ اس دن کو اتنا لمبا کردے گا یہاں تک کہ اس امت کا آخری فرد دجال کو قتل نہ کردے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یہ لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا: تم لوگ نہر اردن مشرق میں ہوں گے اور وہ اس کے مغرب میں ہوں گے، یہاں تک کہ یہودی کسی درخت یا پتھر کے پیچھے چھپا ہوگا تو درخت اور پتھر کہے گا کہ اے مسلمان! اے مردِ مجاہد! اے اللہ کے بندے! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہے آؤ اور اسے قتل کردو۔